یکم مارچ ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۵

پندرہ روزہ معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱ ـ ۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱ـ۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ـ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ـ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ـ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

٤ ـ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ـ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

امریکا: سب سے پہلے یا سب کے خلاف

Jean-Francois Boittin

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے ساتھ گلوبلائزیشن کے برفانی دارالحکومت ڈیووس (سوئٹزرلینڈ) تک سفر کرنے والی کورٹ نے ایک پیغام ضرور دیا کہ ''امریکا فرسٹ'' کا لازمی مفہوم صرف امریکا یا تنہا امریکا ہرگز نہیں۔ دکھ اس بات کا ہے کہ ڈیووس میں دوستی، تعاون اور اشتراکِ عمل کا جو پیغام دیا گیا اس کا اثر ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں رہا۔ یہ وہی ثابت ہوا جس کے لیے امریکی صدر ہمیشہ میڈیا کو قصور وار ٹھہراتے ہیں یعنی فیک نیوز۔

ٹرمپ اور ان کی ٹیم نے جو بنیادی اور مرکزی پیغام دیا، اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہونی نہیں چاہیے۔ یہ کہ امریکا سے لین دین کی ایک قیمت ہے اور یہ قیمت خود امریکا طے کرے گا۔ اس بات کی پروا کون کرتا ہے کہ اس طور مقرر کی جانے والی قیمت سے امریکا دوستوں اور دشمنوں سے یکساں طور پر تصادم کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

امریکی وزیر خارجہ نے مونرو ڈاکٹرائن کا ذکر کیا ہے۔ اُن کا استدلال ہے کہ یہ ڈاکٹرائن آج بھی اسی طور قابلِ اطلاق ہے، جس طور دو صدیوں پہلے تھی۔ یہ بیان جنوبی اور وسطی امریکا سے ان کے ساتھیوں کی میٹنگوں کے موقع پر سامنے آیا۔ ٹلرسن بہت آسانی سے کہہ سکتے تھے کہ وہ واشنگٹن کے پچھواڑے یا امریکا کی نوآبادیات کا دورہ کرنے والے ہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، وہ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ چین کو لاطینی امریکا کے ممالک سے معاملات کا کوئی حق نہیں۔

حقیقی دنیا میں اِسی چین نے سانتیاگو (چلی) میں CELAC (کمیونٹی آف لیٹن امریکن اینڈ کیریبین اسٹیٹس) کے ارکان کے ساتھ ایک کامیاب سربراہ اجلاس منعقد کیا۔ کسی بھی طرح کے گرینڈ ڈیزائن کا دعویٰ نہ کرتے ہوئے چین نے جنوبی امریکا اور کیریبین کے ممالک کو ون بیلٹ ون روڈ کی پیشکش کی۔ چین اشیا کی درآمد بڑھانے، تیار شدہ اشیا کی برآمدات میں اضافے اور سرمایہ کاری کا گراف بلند کرنے کے لیے تیار ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ماحول کو محفوظ رکھنے سے متعلق اقدامات میں تعاون سے بھی گریز نہیں کر رہا۔ اس نے حال ہی میں چلی سے آزاد تجارت کے معاہدے کو نئی شکل دی ہے۔

امریکا کے لیے یہ سب کچھ بہت حد تک بدحواس کرنے والا ہے۔ صدر ٹرمپ کے تحت واشنگٹن خاصا الجھا ہوا ہے۔ اپنے دو قریب ترین ہمسایوں کے ساتھ وہ تجارت کے معاملات میں بہتر کارکردگی کا حامل نہیں رہا۔ یہ دونوں اس کے سب سے بڑے تجارتی پارٹنر ہیں۔ ٹرمپ کی ٹیم نارتھ امریکا فری ٹریڈ ایگریمنٹ (نیفٹا) کی شرائط تبدیل کرنے کا عزم کیے ہوئے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ معاہدے کی میعاد پانچ سال رکھی جائے اور اگر کوئی فریق اسے طول دینے کے لیے تیار نہ ہو تو معاہدہ خود بخود ختم ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ خطے کے ممالک میں سرمایہ کاری کو زیادہ سے زیادہ شفاف بنانے پر توجہ دی جائے۔

یہ سب کچھ گویا بہت کم تھا اس لیے ٹرمپ انتظامیہ نے شمالی امریکا میں چینی مفادات کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کی غرض سے واشنگٹن مشینز اور سولر پینلز کی درآمد پر بھی پابندی عائد کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے میکسیکو اور کیریبین ممالک پر جرمانے بھی عائد کیے گئے جبکہ ٹرمپ انتظامیہ کے متعلقہ ادارے نے امریکی صنعت کو بچانے سے متعلق اقدامات کے حوالے سے برآمدات پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔

اپنے ''لامحدود وژن'' کے زیر اثر ٹرمپ نے کچھ اور ہی فیصلہ کیا۔ اس بات پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ چین اور CELA کی میٹنگ کے بعد چلی کے وزیر خارجہ نے کہا ''یہ میٹنگ واضح طور پر پروٹیکشن ازم اور یکطرفہ اقدامات کی ذہنیت کے خلاف ہے''۔

بات ایشیا کی ہو تو معاملات مزید خرابی کی نذر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں امریکی ٹیم ایک ایسے گینگ کی طرح دکھائی دیتی ہے، جو ناک کی سیدھ میں فائر کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو۔ ہر بار اپنے پیروں ہی پر فائر کر دیا جاتا ہے۔

ٹرمپ نے منصب سنبھالنے کے تین دن بعد ہی ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ سے الگ ہونے کا اعلان کیا، جس کے نتیجے میں معاملات مزید خراب ہوتے چلے گئے۔ امریکا کے صدر کی

اندرونی صفحات پر:۔

حیثیت سے ٹرمپ نے ٹرانس پیسفک پارٹنر شپ کو امریکا سے واضح ''زیادتی'' قرار دیا۔ مگر خیر، اس کے نتیجے میں تجارت کے محاذ پر امریکا کے لیے کچھ زیادہ امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ امریکا میں تجارتی معاملات کے سیاہ و سفید پر دسترس رکھنے والے بیدار نہ ہوئے۔ اس کے بجائے یہ اقدام جنوب مشرقی ایشیا میں چین کے اثرات کا مقابلہ کرنے اور توازن پیدا کرنے کے حوالے سے اچھی کوشش ثابت ہوا۔

ویتنام اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ ملک ریاستی ملکیت والے صنعتی اداروں اور غیر ریاستی مزدور انجمنوں کے خلاف چند ایک پابندیاں قبول کرنے کو تیار تھا۔ یہ عزم لبرل معیشت کے اصولوں کو اپنانے سے کہیں بڑھ کر شمال میں بڑے پڑوسی سے اپنے آپ کو دور کرنے کے اقدام کے طور پر زیادہ دیکھا گیا۔

ٹرمپ انتظامیہ نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ سے امریکا کا نکل جانا اس معاہدے کے لیے موت ہی کی ایک شکل ہوگی۔ یہ اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا۔ جاپان اور آسٹریلیا نے مل کر ایسی کوششیں کی ہیں، جن کی مدد سے اس وسیع الجہاد معاہدے کو زندہ رکھنا ممکن ہوسکا ہے۔ امریکا کے بغیر بھی یہ معاہدہ بہت اچھی طرح کام کر رہا ہے۔

نیا ٹی پی پی تھوڑا سا ترمیم شدہ ہے۔ زرعی اثاثوں سے متعلق چند ایک اقدامات کیے گئے ہیں، جیسا کہ امریکا کا مطالبہ تھا۔ نئے ٹی پی پی کے تحت جاپان کو اپنی تیار شدہ صنعتی اشیا اور آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کو اپنی زرعی اشیا کی فروخت کے حوالے سے امریکا پر واضح برتری حاصل ہوگی۔

امریکا نے اپنی صنعتوں کو بچانے کے لیے جو اقدامات کیے ہیں، ان سے صرف چین متاثر نہیں ہوگا بلکہ اتحادیوں پر بھی شدید منفی اثرات مرتب ہوں گے۔ سولر پینلز کی فروخت روکنے کے حوالے سے امریکا نے جو اقدامات کیے ہیں، وہ صرف چین کو ذہن نشین رکھتے ہوئے یقینی بنائے گئے ہیں۔ چین کے سولر پینلز پر اینٹی ڈمپنگ ڈیوٹی عائد کیے جانے سے امریکا کے لیے چین کی متعلقہ درآمدات پانچ برس میں ۵۹ فیصد سے گر کر ۱۱ فیصد پر آگئیں۔

سولر پینلز اور دیگر اشیا کی برآمد روکنے سے متعلق اقدامات کے نتیجے میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والے ممالک میں ملائیشیا، جنوبی کوریا، ویتنام اور تھائی لینڈ ہیں۔ ویتنام اور تھائی لینڈ گھریلو استعمال کی واشنگ مشین کے حوالے سے بنیادی ہدف ہیں۔ ان ممالک کی بنائی ہوئی واشنگ مشینز کی برآمد شدید متاثر ہوئی ہیں۔ جنوبی کوریا میں صنعت کار اب کھل کر کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ امریکیوں نے کیا ہے اس کے باوجود وہ اگر دوست ہیں تو پھر دشمنوں کی ضرورت کسے ہے؟

ایشیا میں امریکا نے چین کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے جو اقدامات کیے ہیں، وہ اب تک خاصے مضحکہ خیز ثابت ہوئے ہیں اور ظاہر ہے، ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں۔ اب واشنگٹن میں یورپی یونین کو ایک ایسے پارٹنر کے طور پر دیکھا جائے گا، جو چین کے بڑھتے ہوئے عروج کو دیکھتے ہوئے کھیل کے اصول بہتر انداز سے طے کرنے پر خاطر خواہ توجہ دے گا۔

یورپ چاہتا تھا کہ ٹرانس اٹلانٹک پارٹنر شپ کو بہتر شکل دی جائے، اشتراک عمل کے لیے زیادہ گنجائش پیدا کی جائے، مگر ٹرمپ انتظامیہ نے اسے اپنے ایجنڈے پر رکھا ہی نہیں۔

امریکی وزیر تجارت ولبر راس نے ڈیووس میں اس حوالے سے بات چیت دوبارہ شروع کیے جانے کا امکان ظاہر کیا۔ مگر خیر، ایسا لگتا ہے کہ اس حوالے سے معاملات زیادہ خوش اسلوبی سے آگے نہ بڑھ سکیں گے کیونکہ ٹرمپ انتظامیہ نے ''امریکا فرسٹ'' کی پالیسی اپناتے ہوئے امریکیوں پر زور دیا ہے کہ وہ امریکی مصنوعات کی خریداری کو ترجیح دیں۔

ایک بنیادی مسئلہ ڈونلڈ ٹرمپ کی چھوٹی سوچ کا ہے۔ وہ کسی بھی معاملے میں بڑا سوچنے کے عادی ہیں نہ اہل۔ برطانیہ کے آئی ٹی وی کو ان کے انٹرویو سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عالمگیر سطح کے معاملات کو بھی وہ وسیع تر تناظر میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا تھا ''میں بتاؤں کہ امریکا کی نمائندگی کوئی آسان کام نہیں۔ ہم اپنی مصنوعات کو عالمی منڈی میں آسانی سے داخل کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ چین اور دیگر ممالک اپنی مصنوعات ہمارے ہاں بھیجتے ہیں تو ان پر بہت کم ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ درست نہیں۔ یورپی یونین سے معاملات طے کرنا بھی میرے لیے آسان نہیں رہا۔ تجارت کے نقطۂ نظر سے معاملات مزید خرابی کی طرف جاسکتے ہیں۔ تجارت کے معاملے میں یورپی یونین نے امریکا سے اچھا سلوک روا نہیں رکھا۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ بات خود یورپی یونین کے حق میں بھی نہیں جائے گی''۔

اس تجزیے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امریکی صدر کی ذہنی سطح کیا ہے۔ بڑھک مارنا اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال کرنا اپنی جگہ، سوال بصیرت کا ہے جو دکھائی ہی نہیں دیتی۔ امریکا بدلتی ہوئی دنیا کے تقاضوں کو سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے بجائے اب بھی اپنی مرضی کے مطابق کچھ بھی کرنے کی پالیسی پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ ایسا کرنا زیادہ کارگر ثابت نہ ہوگا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"America First — Or Against All?".
("The Globalist". February 13, 2018)

بنگلا دیش: جمہوری اعشاریے کی پست ترین سطح پر!

''اکنامسٹ'' انٹیلی جنس یونٹ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق آزادیٔ اظہارِ رائے پر پابندی، انسانی اور جمہوری حقوق پر قدغن اور ان معیارات کی تنزلی کی وجہ سے بنگلا دیش عالمی جمہوری اعشاریہ بندی میں گزشتہ دس سال کے پست ترین درجے میں موجود ہے۔ حالیہ درجہ بندی میں ۱۶۷ ممالک میں بنگلا دیش کا نمبر ۹۲ ہے۔ جبکہ گزشتہ سال ۸۴ تھا۔

EIU کے مطابق دنیا کی آبادی کے صرف ۵ فیصد انسانوں کو مکمل جمہوری حقوق حاصل ہیں۔ رپورٹ میں صرف ۸ ویں درجے سے اوپر ممالک کو مکمل جمہوری نظام کا حامل قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ سال امریکی ووٹروں کے اپنی حکومت، منتخب نمائندوں اور سیاسی جماعتوں پر عدم اعتماد کے باعث، امریکا مکمل جمہوری آزادی کے حامل ملک سے کمزور جمہوری ممالک کی فہرست میں شامل ہوگیا ہے۔ ۲۰۱۷ء کی اس درجہ بندی میں کوئی ایک ملک بھی اپنے گزشتہ سال کے مقام کو برقرار نہیں رکھ سکا ہے۔ ایشیا اور براعظم آسٹریلیا کے ممالک کارکردگی کے اعتبار سے کم ترین درجے پر ہیں۔ اس رپورٹ کے مطابق دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی آمرانہ طرز حکومت کی تحت زندگی گزار رہی ہے۔ اس اعتبار سے چین سرفہرست ہے۔

اس اعشاریہ بندی میں انتخابی عمل، جمہوری آزادی، سیاسی کلچر، سیاسی عمل میں عوام کی شرکت اور حکومتوں کی مجموعی کارکردگی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس درجہ بندی کا آغاز ۲۰۰۶ء میں کیا گیا تھا، اس اعتبار سے یہ اس کا دسواں ایڈیشن ہے۔

ناروے دوبارہ اس درجہ بندی میں پہلے نمبر پر ہے۔ جبکہ آئس لینڈ اور سوئیڈن کا بالترتیب دوسرا اور تیسرا نمبر ہے۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Bangladesh's score on democracy index lowest in a decade".
("bdnews24.com". January 31, 2018)

افغانستان: امریکا کی نہ ختم ہونے والی جنگ

احسان احراری

صدر ڈونلڈ ٹرمپ افغانستان کی جنگ میں فتح کے حصول کے لیے بے قرار دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وسط ایشیا میں واقع اس ملک کے ساڑھے تین کروڑ عوام کی مزاحمت برقرار ہے، اوراس ملک میں بہت سی قوموں کے ہزاروں جنگجوؤں نے اپنے خون سے تاریخ رقم کی ہے۔ ٹرمپ کو اپنے پیشرو اوباما کی طرح صورتحال سمجھنے میں مشکلات کا سامنا ہے، وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ امریکا اور طالبان کے لیے فتح اور شکست کے پیمانے مختلف ہیں۔ طالبان کے لیے فتح کا مطلب ہے غیر ملکی حملہ آوروں سے جنگ کو طول دینا، اس طرح موجودہ صورتحال میں طالبان کو فاتح کہا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ صورتحال زیادہ عرصہ جاری نہیں رہ سکتی، کیوں کہ امریکا پوری طاقت سے افغانستان میں مخالفین کو کچل دینے کے درپے ہے اور وہ افغانستان میں مستحکم اور مغرب نواز حکومت کا قیام یقینی بنانا چاہتا ہے۔

طالبان اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اپنے ملک میں نقصان برداشت کرنے کی ان کی صلاحیت لامحدود ہے، لیکن امریکا کے لیے ایسا کچھ نہیں ہے۔ امریکا جیسے جمہوری ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ طالبان کو شکست دے اور ان کو اتنا کمزور کردے کہ وہ امریکا کی شرائط پر امن قائم کرنے کے لیے رضامند ہوجائیں۔ مگر طالبان کی اس طرح کی شکست کا کوئی امکان نہیں، طالبان نے افغانستان کے بڑے حصے پر قبضہ کررکھا ہے۔ حالات کا دھارا جنگ میں طالبان کی فتح کو ظاہر کررہا ہے۔ اگر اس کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ کے بارے میں کسی افغانی سے سوال کیا جائے تو اس کا جواب طالبان کے حق میں ہی ہوتا ہے اور امریکا کے اعلیٰ فوجی افسران بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن عوام کے سامنے یہ بات کہنے پرآمادہ نہیں ہوتے، ان حالات میں ابھی یا پھر مستقبل میں افغانستان کو کھودینے کا امکان برقرار ہے۔

امریکا میں دفاعی اور سول اہلکاروں کی بڑی تعداد نہ ختم ہونے والی جنگ سے اچھا کما رہی ہے۔ بہت سے اہم سیاستدان سمجھتے ہیں کہ افغانستان میں فتح کا کوئی امکان نہیں، مگر ان کے پاس حکمت عملی میں تبدیلی لانے کے اختیارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ۲۰۱۶ء کے صدارتی انتخابات میں افغان جنگ عوامی بحث کا موضوع نہ بن سکی، صدارتی امیدوار کی حیثیت سے ٹرمپ نے اس تنازعہ کے حل کا کبھی اشارہ بھی نہیں دیا، جبکہ ہیلری کلنٹن طالبان کو شکست دینے میں ناکامی پر اوباما پر تنقید کیے بغیر اس موضوع پر بات ہی نہیں کرسکتی تھیں۔

افغانستان میں امریکی فوج کے کمانڈر جنرل جان ڈبلیو نیکولسن نے مسئلہ کا حل طالبان کے زیر قبضہ علاقوں میں افیون کی کاشت پر بمباری کرنا قرار دیا، ان کو امید ہے کہ طالبان کو مالی طور پر تباہ کرکے جنگ لڑنے سے باز رکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اصولی طور پر ایک مناسب نتیجہ اخذ کیا ہے، مگر اس میں طالبان کے مسلسل جنگ کرنے کے عزم کو نظر انداز کردیا گیا ہے۔ حال ہی میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق طالبان نے کئی برسوں کی غیر قانونی سرگرمیوں اور افیون کی پیداوار سے اربوں ڈالر جمع کرلیے ہیں۔ صدر ٹرمپ کی جانب سے نئی قومی سلامتی پالیسی کی منظوری کے بعد بریگیڈیئر جنرل لانس طالبان سے لڑنے کے لیے پُرامید ہیں۔ دی واشنگٹن ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ”نئی پالیسی کا مرکزی نقطہ لانس کے نزدیک فضائی حملے ہیں، جو طالبان کے منافع بخش کاروبار کو تباہ کرنے کے لیے ڈیزائن کیے گئے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق نئی انتظامیہ نے امریکی فوجی کمانڈروں کو طالبان کے نیٹ ورک اور آمدنی کے ذرائع کو نشانہ بنانے کی اجازت دے دی ہے، اس کے ساتھ ہی زمین پر لڑنے والی افغان فوج کو بھی فضائی مدد فراہم کی جائے گی۔ اس سے قبل یہ اجازت نہیں تھی، ایک اور اہم تبدیلی کی گئی ہے جس کے مطابق اب میدانِ جنگ میں موجود افغان فوجیوں کے ساتھ امریکی مشیر رابطے میں رہیں گے۔ شام اور عراق میں داعش کے خلاف استعمال کی گئی حکمت عملی کو طالبان کے خلاف استعمال کرنا بھی اس منصوبے کا حصہ ہے۔ لیکن اس کے لیے امریکا کو بھی ماضی کے مقابلے میں سنجیدگی اور مختلف انداز سے سوچنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ کیوں کہ امریکا کو دوسرے ممالک کے تعاون کی ضرورت ہوگی۔

افغانستان میں جنگ کو دو محاذوں پر لڑنے کی ضرورت ہے، ایک عسکری محاذ اور دوسرا سفارتی محاذ جو مشکل محاذ بھی ہے۔ جنگی نقطہ نظر سے افغانستان پر امریکی برتری واضح نظر آتی ہے، لیکن طالبان پر تزویراتی فتح حاصل کرنے کے لیے دو علاقائی کردار پاکستان اور چین کو ساتھ ملانا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی طالبان کو افغانستان کی مستقبل کی حکومت کا حصہ بنانے کی خواہش کو قبول کرنا ہوگا، اگر ٹرمپ انتظامیہ ان باتوں سے اتفاق کرتی ہے تو ایک اور امریکی پالیسی بنے گی جس میں ان نکات کو اہمیت دی جائے گی۔ اس پالیسی میں طالبان کو مذاکرات کی میز پر لانے کے لیے اقدامات کرنے پر پاکستان اور چین کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔

افغان تنازعے کے حوالے سے امریکا کے لیے سب سے حوصلہ افزا بات یہ ہوسکتی ہے کہ چین کو پاکستان اور وسط ایشیائی ممالک میں بیلٹ اور روڈ منصوبے کی کامیابی کے لیے فوری طور پر افغانستان میں استحکام کی ضرورت ہے۔ چین کی حکومت نے اس حوالے سے بڑے سیاسی اور اقتصادی وعدے کرکے بہت کچھ داؤ پر لگا دیا ہے۔ چین تسلیم کرتا ہے کہ طالبان بنیادی طور پر افغانستان کی مستقبل کی حکومت میں کردار چاہتے ہیں۔ داعش کے برعکس طالبان عالمی جہاد کو افغانستان لانے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ چین کے طالبان سے درپردہ رابطوں کی وجہ بھی یہی تھی، اس کے ساتھ ہی چین کو مکمل طور پر ادراک ہے کہ صوبے سنکیانگ کے شدت پسندوں نے طالبان سے طویل عرصے سے تعلقات قائم کررکھے ہیں، جس کے ذریعے وہ سیاسی طاقت کو فروغ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔ پاکستان چین کو بڑی طاقت کے طور پر اہمیت دیتا ہے، دونوں ممالک ایک دوسرے کو ”ہر موسم“ کا دوست تسلیم کرتے ہیں۔ شاید پاکستان یہ فیصلہ کرچکا ہے کہ روایتی پاک امریکا تعلقات کی غیر موجودگی میں چین کی تزویراتی ترجیحات کا ساتھ دیا جائے۔ اس طرح پاکستان کی افغان امن عمل میں کردار ادا کرنے کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی۔ پاکستان کو بھارت کا کردار بڑھائے بغیر افغانستان کو مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان پہلے ہی الزام لگاتا رہا ہے کہ بھارت افغانستان میں سفارتی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بلوچستان کے حالات خراب کررہا ہے، جبکہ بھارت اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ امریکا کو سمجھنا چاہیے کہ پاکستان کے لیے افغانستان میں بھارت کے سفارتی اور فوجی اہلکاروں کی موجودگی میں اضافہ سرخ جھنڈے کی طرح ہے۔ افغانستان میں بھارت کی موجودگی پر پاکستانی تشویش کو دور کرنے کے لیے اوباما اور ٹرمپ نے کبھی اقدامات نہیں کیے۔ لہٰذا امن مذاکرات میں پاکستان کو دوبارہ شامل کرنے کے لیے پاکستان کی بھارت کے حوالے سے تشویش پر غور کیا جانا چاہیے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ دونوں پڑوسی جنوبی ایشیائی ممالک کو ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے لیے اکسایا جائے۔

۴ جنوری کو محکمہ خارجہ کی جانب سے پاکستان کی سیکورٹی امداد

معطل کرنے کے اعلان سے خارجہ پالیسی کے حوالے سے ٹرمپ کی خالص کاروباری سوچ ظاہر ہوگئی۔ اس عمل کے بارے میں ٹرمپ نے چند دن قبل ٹویٹ کرکے وارننگ دے دی تھی۔ ٹرمپ کے مطابق ''امریکا نے پاکستان کو ۳۳؍ارب ڈالر دے کر بے وقوفی کی، جس کے بدلے کچھ حاصل نہیں ہوا''۔ امریکا کو توقع ہے کہ پاکستان پر دباؤ ڈال کر کام کرایا جاسکتا ہے، مگر دباؤ پاکستان کی مزاحمت میں اضافہ کرے گا۔ یہاں اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ ٹرمپ امریکا کے دوستوں کے ساتھ بھی خالص کاروباری سوچ کے ساتھ معاملات طے کررہے ہیں۔ بہرحال اتحادیوں اور مخالفین کو پاکستان اور چین کے تعاون کی ضرورت ہے، ان دونوں ممالک کے تعاون کرنے کی بنیادی وجوہات بھی موجود ہیں۔ پاکستان اور چین افغانستان میں استحکام اور امن چاہتے ہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خاموش سفارت کاری کی جائے نہ کہ عوامی سطح پر لعنت ملامت کی جائے۔ افغانستان میں استحکام کے لیے پاکستان اور چین کا تعاون حاصل کرنے میں امریکی محکمہ خارجہ اور دفاع کا کردار بہت اہم ہوگا۔ ٹرمپ کی جانب سے محکمہ خارجہ کی اہمیت کو کم کرتے ہوئے اس کے بجٹ میں کٹوتی کرنا اور علاقائی تنازعات کے حل کے لیے فوج پر انحصار کرنا امریکا کو درپیش سنگین چیلنجوں میں سے ایک ہے۔ افغانستان میں استحکام کے لیے ٹرمپ انتظامیہ نئی حکمت عملی اپنانے کی ضرورت کا اندازہ ہی نہیں کرسکی ہے۔ میڈیا رپورٹس کے مطابق ٹرمپ امریکی وزیر خارجہ ریکس ٹلرسن کی جگہ سی آئی اے چیف مائیکل پومپیو یا اقوام متحدہ میں امریکی مندوب نکی ہیلی کو لگانا چاہتے ہیں، دونوں ممکنہ امیدواروں کا پاکستان، جنوبی ایشیا اور چین کے حوالے سے سفارتی تجربہ نہیں ہے۔ وزیر دفاع جیز میٹس اس حوالے سے کافی تجربہ کار ہیں۔ ان کو کوئی اہم کردار سونپا جاسکتا ہے۔ افغانستان میں امن و استحکام کے طویل مدتی امریکی وعدے کو پورا کرنے کے لیے پاکستان اور چین کو سیاسی معاملات میں یقین دہانی کرانا ہوگی، جو امریکی محکمہ خارجہ صبر آزما اور پیچیدہ مذاکرات کے ذریعے کرواسکتا ہے۔ ٹیلرسن کو عہدے سے ہٹایا جانا اس بات کی علامت ہوگا کہ امریکا اس خطے سے نکلنے سے قبل مسئلے کا فوری اور جزوی حل چاہتا ہے۔ افغان تنازع کے حل کے لیے امریکا کو مختلف طریقے اپنانا ہوں گے۔ ورنہ مکمل شکست کا امکان ہمیشہ موجود رہے گا۔

(احسان احراری امریکی فوج کے وار کالج پنسلوانیا میں پروفیسر ہیں)

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"US strategy in Afghanistan requires diplomacy and military power".

("eurasiareview.com". January 24, 2018)

بنگلادیش: جابرانہ آمریت کی طرف ایک اور قدم

خالدہ ضیا گزشتہ ایک دہائی سے عدالتوں کا سامنا کررہی ہیں۔ ان کے خلاف ۳۷ مختلف مقدمات تھے، جن میں سے ایک اہم مقدمہ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۶ء اور ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۶ء تک بحیثیت وزیراعظم اختیارات کا غلط استعمال اور بدعنوانی کے الزام کے حوالے سے ہے۔ ۸ فروری کو سنایا جانے والا یہ عدالتی فیصلہ تاریخی ہے۔

خالدہ ضیا، جو بنگلادیش نیشنل پارٹی (BNP) کی سربراہ ہیں، کو ۱۹۹۱ء میں اپنے مرحوم شوہر ضیاء الرحمٰن (جو شیخ مجیب کے خلاف ہونے والی بغاوت کے قائد تھے اور شیخ مجیب کو صدارت سے ہٹانے کے بعد ملک کے صدر بنے اور بعد میں خود بھی ایک بغاوت کے نتیجے میں قتل ہوئے) کی یاد میں قائم یتیموں کے ایک ٹرسٹ سے رقم خورد برد کرنے کے الزام میں ۵ سال قید کی سزا سنائی گئی ہے، خالدہ ضیاء کے پاس ابھی ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اپیل کا حق ہے، لیکن لگتا ایسا ہے کہ وقت ان کا ساتھ نہیں دے گا۔

عدالتی حکم سے بنگلادیشی سیاست سے دو جماعتی نظام اور ضیاء الرحمٰن کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ بی این پی اور حکمران جماعت عوامی لیگ ماضی میں یکے بعد دیگرے اقتدار میں آتی رہی ہیں۔ خالدہ ضیاء اور وزیراعظم حسینہ واجد یہ دونوں خواتین بنگلادیشی سیاست پہ چھائی رہی ہیں لیکن گزشتہ ایک دہائی سے خالدہ ضیا کی طاقت کمزور پڑ رہی ہے۔ انتخابات کے دوران ایک غیر جانبدار نگراں حکومت کو اختیارات نہ دینے کے حوالے سے کی گئی عوامی لیگ کی آئینی ترمیم کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے BNP نے ۲۰۱۴ء کے انتخابات کا بائیکاٹ کیا، جس کی وجہ سے پارلیمان میں ان کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

بی این پی کا یہ نعرہ ہے کہ ''خالدہ ضیا ہماری سربراہ ہیں، ضیا الرحمٰن ہمارا نظریہ ہے، طارق رحمٰن ہمارا مستقبل ہے''۔ لیکن خالدہ ضیا کی عمر ۷۲ سال ہے اور ان کی صحت بھی خراب ہے۔ عدالتی حکم کے بعد وہ شاید آئندہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکیں۔ ان کے بیٹے اور سیاسی وارث طارق رحمٰن کو بھی مختلف مقدمات کا سامنا ہے اور وہ جلاوطنی میں ہیں۔

عدالتی حکم بنگلادیشی وزیراعظم کے اِس اعلان کے صرف ایک ہفتے بعد آیا، جس میں انھوں نے بتایا کہ پارلیمانی انتخابات دسمبر میں منعقد ہوں گے۔ ۲۰۱۴ء کے انتخابات میں حسینہ واجد نے خالدہ ضیا کو نظر بند کردیا تھا اور ملک کی تیسری بڑی جماعت کے سربراہ محمد ارشاد کو ایک فوجی اسپتال تک محدود رکھا۔ عوامی لیگ نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے ملک کو سیکولر ریاست قرار دیا، جس کی وجہ سے عدالت نے بی این پی کی اتحادی مذہبی جماعت، جماعت اسلامی کو انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا۔

تاہم اب حکومت چاہتی ہے کہ BNP انتخابات میں حصہ لے، تاکہ ان انتخابات کو ۲۰۱۴ء کے انتخابات کی طرح مضحکہ خیز بننے سے روکا جائے۔ الیکشن کمیشن کا کہنا ہے کہ معنی خیز انتخابات کے لیے بی این پی کا انتخابات میں حصہ لینا ضروری ہے۔

خالدہ ضیا کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر اُن کی جماعت انتخابات میں حصہ نہیں لیتی تو قانونی طور پر اس کی رجسٹریشن منسوخ ہوسکتی ہے۔ تجزیہ نگاروں کے مطابق بی این پی یا اُس کے کچھ دھڑے سیاسی گمنامی کی جگہ پارلیمان میں اپنی موجودگی کو ترجیح دیں گے۔ حکومت بھی بی این پی کو انتخاب لڑنے پہ آمادہ کرنے کے لیے اُن کو بڑے پیمانے پر سرکاری نوکریوں سے نواز سکتی ہے اور ان کے خلاف قائم مقدمات کو کم کرنے کا اعلان کرسکتی ہے۔

تاہم اس وقت بی این پی حکومت کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہے ۳ فروری کو ہونے والے تنظیم کے اعلیٰ سطحی اجلاس میں اعلان ہوا کہ اگر انتخابات غیر جانبدار نگران حکومت کی نگرانی میں نہ ہوئے تو بی این پی انتخابات کا بائیکاٹ کرے گی۔ حکومت نے گزشتہ ہفتے بی این پی کے ۱۱۰۰ سے زائد کارکنان کو گرفتار کیا تھا، اور مظاہرین کو دارالحکومت ڈھاکا سے دور رکھنے کے لیے چوکیاں بھی قائم کردی تھیں۔ بی این پی کے اعلیٰ عہدے داروں کا کہنا ہے کہ یہ رویہ حکومت کے خلاف اشتعال کو مزید ہوا دے گا۔

شیخ حسینہ واجد مظاہروں اور اشتعال سے ڈرنے والی نہیں ہیں، وہ ۲۰۱۴ء میں پولنگ اسٹیشنوں میں بم دھماکوں اور جلاؤ گھیراؤ کا سامنا کرچکی ہیں۔ وہ گزشتہ دس سالوں میں فوج کی تعداد دگنی کرکے اور کئی نئے فوجی اڈے تعمیر کرکے فوج کی حمایت حاصل کرچکی ہیں۔ اس صورتحال میں شیخ حسینہ واجد کی اقتدار سے بے دخلی مشکل نظر آتی ہے۔ (ترجمہ: محمد عمید فاروقی)

"In the dock and on the ropes".

("The Economist". Feb.10, 2018)

ٹرمپ کا دورِ صدارت: امریکی کردار

(تیسرا اور آخری حصہ)

Hal Brands

فلاح سوچنے والا اتحادی

ایک تصور یہ ہے کہ چند ہم خیال اقوام ہیں جن کے ساتھ مل کر امریکا کو مفادات کے تحفظ کے لیے کوششیں کرتے رہنا چاہیے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اس تصور کے بھی خلاف ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیلمرسٹن نے کہا تھا کہ بین الاقوامی امور میں دائمی دوست ہوتے ہیں نہ دائمی دشمن۔ صرف دائمی مفادات ہوتے ہیں مگر پھر بھی چند ایک اقوام کے ساتھ ہر حال میں دوستی رکھنا پڑتی ہے کیونکہ خیالات، پالیسیوں اور مفادات کی یکسانیت ایسا کرنے کی تحریک دیتی ہے۔ امریکا جن ممالک سے دوستی کا حامل ہے ان کی اکثریت یورپ اور ایشیا بحرالکاہل میں ہے۔ یہ اقوام جمہوریت اور لبرل ازم کے حوالے سے امریکا سے خیالات وتصورات میں ہم آہنگ ہیں اور یہی دوستی اور اتحاد کی بنیاد بھی ہے۔

ٹرمپ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے نیٹو میں امریکی اتحادیوں کو بھی چھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر انہوں نے خاصا توہین آمیز رویہ اختیار کیا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ امریکا سے بہت کچھ لیا جارہا ہے مگر اسے جواب میں کچھ نہیں دیا جارہا۔ پیرس میں ماحول سے متعلق کانفرنس کا بھی یہی معاملہ تھا۔ امریکی پالیسی سازوں کے لیے یہ بات بہت پریشان کن ہے کہ ٹرمپ ایک زمانے کے پکے اتحادیوں کو بھی ناراض کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ایک طرف تو انہوں نے روس کے صدر ولادیمیر پوٹن کی طرف جھکاؤ دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اور دوسری طرف یورپی اتحادیوں کو ناراض کرنے والی حکمتِ عملی اپنانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ جرمن چانسلر اینجلا مرکل کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یورپ کی جو اقوام اب تک امریکا کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں، ان کے لیے بھی ٹرمپ نے کچھ زیادہ لگاؤ اور جھکاؤ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

شمالی کوریا کے معاملے میں امریکا نے جنوبی کوریا کے حوالے سے بھی ایسا رویہ نہیں اپنایا جسے قابلِ ستائش قرار دیا جاسکے۔ شمالی کوریا کی طرف سے ایٹمی حملے کی دھمکی کے جواب میں امریکا نے جو کچھ کیا ہے، وہ جنوبی کوریا کو بھی ناراض کرنے کا سبب بنا ہے۔ جنوبی کوریا کی قیادت کو یقین تھا کہ ٹرمپ کچھ ایسا کریں گے جس سے خطے میں استحکام پیدا ہو مگر اب تک ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیا ہے۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے ذہن میں یہ تصور کیل کی طرح ٹھکا ہوا ہے کہ دنیا بھر میں بہت کچھ اگر سہا ہے تو امریکا نے اور سارے فوائد اگر بٹورے ہیں تو اتحادیوں نے۔ ان کے خیال میں امریکا جو کچھ کر رہا ہے اس کے لیے اسے اتحادیوں کی ضرورت نہیں۔ یعنی وہ تنہا بھی بہت کچھ کرکے بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ٹرمپ کے ذہن میں یہ آئیڈیا بھی راسخ ہے کہ امریکا کو اتحاد اور دوستی کے بجائے لین دین کا رویہ اپنانا چاہیے، یعنی اگر کوئی ملک امریکا کے ساتھ چلنا چاہتا ہے تو لین دین کی بنیاد پر چل سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دوستی اور اتحاد کچھ لو اور کچھ دو کے خالص کاروباری اصول کی بنیاد پر ہوگا۔ عالمی صورتِ حال کو سمجھنے کے حوالے سے ٹرمپ کی سوچ میں پائی جانے والی یہ بنیادی خامیاں معاملات کو الجھا رہی ہیں۔ امریکا کی طرف دوستی اور اتحاد کا ہاتھ بڑھانے والی بہت سی اقوام اب تذبذب میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ سمجھ چکی ہیں کہ ٹرمپ کی سوچ میں تبدیلی نہ آئی تو معاملات مزید خرابی کی طرف جائیں گی اور انہیں یعنی ان اقوام کو بھی اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ماضی میں جو ممالک امریکا کے اتحادی کی حیثیت سے کام کرنے کے عادی رہے ہیں، وہ بھی اب اپنی پالیسیوں کو تبدیل کر رہے ہیں۔ انہیں اندازہ ہے کہ بدلتی ہوئی دنیا میں پرانے تصورات نہیں چلتے۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی اندازہ ہے کہ جب تک ٹرمپ وائٹ ہاؤس میں ہیں تب تک معاملات کو درست رکھنا انتہائی دشوار ثابت ہوگا۔ یہی سبب ہے کہ دیرینہ اتحادی بھی امریکا سے دوری اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ٹرمپ کی سوچ یہ ہے کہ امریکا کو مستقل اتحادیوں کی ضرورت نہیں یعنی یہ کہ جیسی صورتِ حال ہو، ویسا ہی طرزِ عمل اختیار کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے معاملات بہتر طور پر نمٹائے جاسکتے ہیں۔ پالیسی ساز اِسے کوتاہ نظری ہی قرار دیں گے مگر ٹرمپ کی نظر میں یہ بہترین سوچ ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ بازار میں جیسی صورتِ حال ہو ویسی ہی سوچ اپنانی چاہیے۔ یعنی جس چیز کے دام اچھے مل رہے ہوں اُسے بروقت فروخت کیا جائے اور جس چیز کی کوئی وقعت نہ ہو اُسے خریدنے سے یکسر گریز کیا جائے۔

طاقت اور مقصد

امریکا نے اب تک خود کو جمہوریت اور بنیادی حقوق کا علمبردار قرار دیا ہے۔ وہ دنیا بھر میں لبرل ازم کی اقدار کو فروغ دینے کے لیے کوشاں رہا ہے۔ امریکا کو لوگ فری ورلڈ کی تابندہ ترین علامت کے طور پر دیکھتے ہیں مگر ٹرمپ کے خیال میں امریکا کو اب اپنے کردار پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔ وہ چاہتے ہیں کہ امریکا دنیا بھر میں لبرل ازم، جمہوریت اور بنیادی حقوق کے چیمپین کی حیثیت سے کوئی کردار ادا کرنے کے بارے میں سوچنا ترک کردے اور اپنی جغرافیائی حدود یا زیادہ سے زیادہ علاقائی سطح تک محدود ہوکر سوچے۔ ان کا خیال ہے کہ امریکا نے دنیا بھر میں جمہوریت کے فروغ اور آزاد معاشرے کے قیام کے حوالے سے جو کچھ کیا ہے اُس سے اُس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ ٹرمپ چاہتے ہیں کہ امریکا اب اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ کچھ کم کرے اور اپنی اصلاح پر توجہ دے۔

ٹرمپ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ امریکا نے دنیا بھر میں معاملات کو درست کرنے کا جو ٹھیکا لے رکھا ہے اور اس حوالے سے خدائی خدمت گار والا رویہ اپنایا ہے، وہ غلط ہے۔ اس کے نتیجے میں امریکا پر ذمہ داریوں کا بوجھ بہت بڑھ گیا ہے جسے کم نہ کیے جانے کی صورت میں امریکی ریاست اور امریکی عوام دونوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔ وہ چاہتے ہیں کہ امریکا ساری دنیا کو درست کرنے کے بجائے محدود کردار ادا کرنے کی تیاری کرے اور اپنی اصلاح پر بھی غیر معمولی حد تک متوجہ ہو کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں خرابیاں بڑھیں گی اور معاملات مزید الجھیں گے۔

ٹرمپ کا یہ بھی خیال ہے کہ امریکا نے دنیا بھر میں آزاد معاشرے کے قیام اور جمہوریت کو فروغ دینے کے معاملات میں الجھ کر اپنے لیے مزید کمزوری کا سامان کیا ہے۔ اُن کے خیال میں امریکی پالیسیوں کا بنیادی مقصد اپنے عوام کی خوش حالی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونا چاہیے مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے بجائے امریکی پالیسی ساز لبرل ازم اور جمہوریت کو فروغ دینے کی کوششوں میں جتے رہنے کے نام پر اپنے لیے صرف مشکلات بڑھاتے رہے ہیں۔ امریکی پالیسیوں کا بنیادی مقصد اپنی خوش حالی اور سلامتی کا گراف

زیادہ سے زیادہ بلند کرنا ہونا چاہیے مگر اس کے بجائے معاملات کو مزید خرابی کی طرف لے جایا گیا ہے۔ ٹرمپ چاہتے ہیں کہ اب امریکا خدائی خدمت گار کا کردار ادا کرنا چھوڑ دے اور اپنے معاملات درست کرنے پر زیادہ سے زیادہ توجہ دے۔

ایک بنیادی مسئلہ باڈی لینگویج کا بھی ہے۔ ٹرمپ نے اب تک آمروں سے اچھا رویہ رکھا ہے اور جمہوری قائدین کو زیادہ احترام کی نظر سے دیکھنے سے گریز کیا ہے۔ انہوں نے روس اور چین کو انسانی حقوق کے حوالے سے ان کا کردار یاد دلانے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی ہے اور دوسری طرف انہوں نے عرب حکمرانوں کو جبر سے باز رہنے کی تلقین کرنے پر بھی توجہ نہیں دی۔ ہاں، جرمنی کی منتخب لیڈر انجیلا مرکل کو انہوں نے طنز وتشنیع کا ہدف بنانے سے گریز نہیں کیا۔ یہ رویہ اُن تمام ممالک کو امریکا سے بدظن کرنے کا باعث بن رہا ہے جو اَب تک واشنگٹن کے پالیسی سازوں سے مطمئن رہے ہیں۔ فلپائن کے صدر نے ماورائے عدالت ہلاکتیں یقینی بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر ٹرمپ نے انہیں سراہنا یاد رکھا ہے اور جمہوری قائدین کو بھول بیٹھے ہیں۔

ٹرمپ نے وینزویلا، ایران، شام اور شمالی کوریا میں بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کی مذمت ضرور کی ہے مگر یہ سب کچھ محض بیان بازی کی حد تک ہے۔ اب تک انہوں نے ایسی جامع اپروچ نہیں بنائی، جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ صورتِ حال کو بہتر بنانے کے حوالے سے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ٹرمپ امریکی پالیسیوں میں بہت واضح تبدیلی چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ امریکا نے اپنے کاندھوں پر کچھ زیادہ ہی بوجھ لے رکھا ہے۔ ایک طرف وہ جمہوریت کا علم بردار ہے اور دوسری طرف واحد سپر پاور کی حیثیت سے بھی اُس پر بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اُسے ہر معاملے میں برتری برقرار رکھنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ خالص علمی اور تکنیکی سطح پر بھی اُسے روبہ عمل رہنا پڑتا ہے۔ دوسری طرف سفارتی معاملات میں اُسے یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ اُس جیسی اپروچ کسی کی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر عسکری اپروچ ہے۔ امریکا کا جتنا بھی بھرم ہے وہ محض طاقت کے وسیلے سے ہے۔ امریکی عسکری قوت دنیا بھر کی قوتوں سے زیادہ ہے۔ اسی قوت کی بنیاد پر وہ اب تک واحد سپر پاور ہے مگر یہ سب کچھ ایسا آسان نہیں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ امریکا کو واحد سپر پاور ہونے کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔ امریکی معاشرے کا حال بہت برا ہے۔ اس پر غیر معمولی دباؤ ہے۔ ایک طرف دوست اور اتحادی ہیں تو دوسری طرف دشمن بھی کم نہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ امریکا کو اب دوستوں سے کہیں بڑھ کر دشمنوں کی فکر لاحق ہے۔

ستمبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب میں ٹرمپ نے اس بات سے انکار کیا کہ امریکا اپنی طرزِ حکومت کو دنیا بھر میں پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ ان کا استدلال تھا کہ ہر آزاد اور خود مختار ملک کی آزادی اور خود مختاری کا احترام کیا جانا چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ ہر ملک کو اپنے معاملات درست کرنے پر زیادہ توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ امریکا کو ساری دنیا میں جمہوریت، لبرل اقدار اور دیگر متعلقہ امور کی فکر لاحق ہو اس سے کہیں بڑھ کر اہم یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات درست کرنے پر متوجہ ہو۔ پولینڈ میں خطاب کے دوران انہوں نے مغرب اور انقلابی اسلام کے درمیان تہذیبی جنگ کی بات کی مگر اس معاملے میں زیادہ آگے جانے سے گریز کیا۔ ان کا خطاب اقدار تک محدود تھا۔

امریکا نے نصف صدی سے بھی زائد مدت کے دوران دنیا بھر میں بحرانوں اور دیگر معاملات کی شکل میں ابھرنے والے چیلنجوں کا سامنا کیا ہے۔ کسی بھی خطے میں ابھرتی ہوئی صورتِ حال پر ردِعمل دینے کے معاملے میں امریکا سب سے آگے رہا ہے اور اس معاملے میں چند ممالک نے اس کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ امریکا نے کسی بھی بحرانی کیفیت کا بھرپور جواب دینے کے معاملے میں جو کچھ کیا ہے اس کا بھرپور فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اس کے اتحادی بھی سمجھتے ہیں کہ امریکا نے بہت کچھ برداشت کیا ہے، اس لیے تھوڑا بہت بوجھ وہ بھی بخوشی برداشت کرلیتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ اب بہت مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ امریکی فوج پر دباؤ بہت زیادہ ہے۔ امریکی فوج چونکہ over-stretched ہے اس لیے ٹرمپ اور ان کے ساتھی چاہتے ہیں کہ بوجھ تھوڑا کم کیا جائے۔ روس اور چین چونکہ معاشی اعتبار سے اپنی پوزیشن زیادہ مستحکم کرنے میں مصروف ہیں اس لیے ٹرمپ اور ان کے ساتھی چاہتے ہیں کہ معاملات کو کچھ بہتر بنانے پر توجہ دی جائے۔

امریکا عالمی سطح پر جو کردار ادا کرتا آیا ہے وہ کسی بھی ایسے ملک کے لیے ناگزیر ہے، جو خود کو دوسروں سے برتر سمجھتا ہو اور برتر ہو۔ امریکا چونکہ واحد سپر پاور ہے اس لیے اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے ایسا بہت کچھ کرنا پڑتا ہے جو اُس کی مرضی کا نہیں ہوتا۔ وہ چاہے تو بھی بہت سے معاملات میں اپنے کردار کو گھٹا نہیں سکتا۔ امریکا اور اس کے ہم خیال ممالک کے لیے لازم ہے کہ وسیع تر عالمی کردار ادا کرتے رہیں۔ اب تک امریکا کے لیے حقیقی اور جینوئن اتحادی کا کردار یورپ نے ادا کیا ہے۔ دونوں مشترکہ طور پر مغرب کہلاتے ہیں۔ ہر معاملے میں دنیا اِن دونوں کی طرف دیکھتی ہے۔ علوم وفنون میں غیر معمولی دسترس کے حوالے سے امریکا اور یورپ کا کوئی ثانی نہیں۔ جاپان، جنوبی کوریا، چین، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور چند دوسرے ممالک نے بھی آگے بڑھنے اور کوئی وسیع تر کردار ادا کرنے کے حوالے سے بہت کچھ کیا ہے مگر اس کے باوجود یہ امریکا سے پیچھے رہے ہیں۔ اور یورپ بھی اِن سے آگے رہا ہے۔ امریکی پالیسی ساز امریکا کے لیے وسیع تر عالمی کردار یقینی بنانے پر خاص توجہ مرکوز کرتے آئے ہیں۔ انہیں اندازہ ہے کہ امریکی قیادت کے لیے عالمی سطح پر جانا اور کچھ کر دکھانا انتہائی لازم ہے۔ یہ کردار وہ ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتے۔

امریکا اور یورپ مل کر عالمی سیاست میں جو کردار ادا کرتے ہیں اُس کے اگر بہت سے فوائد ہیں تو چند ایک بڑے نقصانات بھی ہیں۔ امریکا نے مشرق وسطی اور افریقا میں جو کچھ کیا ہے اس کے سنگین نتائج اب رونما ہو رہے ہیں۔ شمالی افریقا اور عرب دنیا سے نقل مکانی کرنے والوں کا رخ یورپ کی طرف ہے۔ اٹلی، جرمنی، فرانس اور دیگر یورپی طاقتوں نے بڑی تعداد میں پناہ گزینوں کو قبول کیا ہے مگر امریکا اس معاملے میں بھی خود کو استثنائی حیثیت کا حامل سمجھتا ہے۔ اس نے نقل مکانی کرنے والوں پر اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ اُسے اندازہ ہے کہ اگر اس نے نقل مکانی کرنے والوں کو بڑے پیمانے پر قبول کیا تو صرف خرابیاں بڑھیں گی اور امریکی معاشرے میں انتشار کا گراف بلند ہوگا۔

ٹرمپ نے امریکی پالیسی سازوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عالمی لیڈر کا سہرا امریکا کے سر باندھنے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اب امریکا یہ سہرا سر سے اتار پھینکے۔ چین اور روس تیزی سے ابھر رہے ہیں۔ ٹرمپ چاہیں گے کہ عالمی قیادت کی ذمہ داری یہ دونوں ممالک مل کر سنبھالیں اور امریکا کو سکون کا سانس لینے کا موقع فراہم کریں۔ ٹرمپ کی خواہش ہے کہ امریکا اب عالمی

قیادت کی ذمہ داری سے سبک دوش ہو کر اپنے گھر کو درست کرنے پر متوجہ ہو۔ عالمی سیاسی کردار ادا کرتے رہنے سے امریکا کو بہت کچھ برداشت بھی کرنا پڑا ہے۔ دہشت گردی کا گراف بلند ہوا ہے جسے نیچے لانے کی بھرپور علاقائی اور عالمی کوششیں کی جارہی ہیں۔ بہت سے علاقائی اور عالمی معاہدوں سے امریکا کا پیچھے ہٹ جانا انتہائی خطرناک ثابت ہوا ہے۔ پیرس میں ماحول سے متعلق بین الاقوامی معاہدے سے امریکا کا پسپائی اختیار کرنا اِسی تناظر میں دیکھا جائے گا۔ یہ پسپائی اس بات کی مظہر ہے کہ امریکا اپنے بین الاقوامی یا عالمی معاہدوں کے حوالے سے نئی اپروچ اختیار کر رہا ہے۔

عام خیال یہ تھا کہ امریکا نے عالمی قیادت کا فریضہ انجام دینا ترک کیا تو جاپان، جرمنی یا کوئی اور یورپی قوت آگے بڑھ کر یہ منصب سنبھالنا چاہے گی مگر سچ یہ ہے کہ چند خطرناک ایکٹرز بھی آگے آرہے ہیں۔ ٹرمپ کے صدر کی حیثیت سے منتخب ہونے کے بعد سے چینی قیادت اپنی قوم کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہے کہ اب اسے عالمی قائد کی حیثیت سے اپنی پوزیشن منوانے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ چین نے عالمی قائد کی حیثیت سے تیزی سے آگے آنے کو ترجیح دی ہے۔

سفارت و سیاست میں بھی ٹرمپ نے نئی حکمتِ عملی اپنائی ہے۔ اس کے نتیجے میں دوستوں کی تعداد بڑھی ہے اور دشمن مزید برافروختہ ہوگئے ہیں۔ چینی قیادت چاہتی ہے کہ عالمی سطح پر بڑا کردار ادا کرے مگر ساتھ ہی ساتھ اُسے امریکا کی طرف سے جوابی کارروائی کا بھی خطرہ ہے۔ امریکا اگرچہ عالمی قائد کا کردار ادا کرنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا مگر وہ چاہے گا کہ کوئی اور ملک بھی اِس معاملے میں آگے نہ بڑھے۔ اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ چین کے راستے میں کانٹے بچھانے کی بھرپور کوشش کرے گا۔

بہرحال، یہ معاملہ ایسا آسان نہیں کہ راتوں رات کچھ کا کچھ ہو جائے۔ اس وقت جو عالمی نظام کام کر رہا ہے اُس کی بنیاد امریکا اور یورپ پر ہے۔ اگر امریکا اپنا عالمی کردار ترک کرنے کو تیار رہے تب بھی اُسے میدان چھوڑنے نہیں دیا جائے گا۔ بہت کچھ ہے جو امریکا کی کمٹمنٹس پر منحصر ہے۔ کئی خطوں کے استحکام کا مدار اس بات پر ہے کہ امریکا اپنا عالمی کردار کس طور ادا کرے گا۔ اگر امریکا پیچھے ہٹ گیا تو خرابیاں محض شدت اختیار نہیں کریں گی بلکہ اُن کا دائرہ بھی وسعت اختیار کرے گا۔ امریکا نے جو عالمی کردار نصف صدی سے بھی زائد مدت سے اپنا رکھا ہے اُسے ادا کرتے رہنے ہی میں موجودہ عالمی نظام کی بقا ہے۔ اس نظام سے امریکا کو کیا ملتا ہے اور کیا نہیں ملتا اس سے بڑھ کر قابلِ بحث یہ نکتہ ہے کہ اگر امریکا اچانک پسپا ہوگیا تو بہت کچھ دھڑام سے زمین پر آرہے گا۔ امریکا اور یورپ کے لیے بہترین آپشن یہ ہے کہ اپنے آپ کو موجودہ صورتِ حال سے رفتہ رفتہ، مرحلہ وار الگ کریں۔ اگر زیادہ سوچے سمجھے بغیر پیچھے ہٹنے کا عمل جاری رکھا گیا تو کئی خطوں میں شدید عدم استحکام پیدا ہوگا جو محض خرابیوں کو جنم دے گا۔

ڈونلڈ ٹرمپ کے امریکا کے صدر کی حیثیت سے منتخب ہونے کے بعد یہ سوال سر اٹھائے ہوئے ہے کہ کیا موجودہ امریکی صدر، جو دنیا کا طاقتور ترین انسان تصور کیا جاتا ہے، عالمی سطح پر ابھرنے والے بحرانوں اور مسائل کو حل کرنے کی بھرپور صلاحیت سے متصف ہے۔ ٹرمپ نے اپنے خیالات اور بیانات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ بہت سے بڑے اور نہایت اہم معاملات میں سنجیدہ نہیں۔ پاکستان سے تعلقات خراب کرنے میں ان کے ٹوئیٹ کا بنیادی کردار ہے۔ دوسرے بہت سے اتحادیوں سے تعلقات بگاڑنے میں بھی اُن کے غیر ذمہ دارانہ بیانات اور لاپروائی پر مبنی انٹرویوز کا کلیدی کردار رہا ہے۔ شمالی کوریا کے بارے میں ان کے غیر ذمہ دارانہ بیانات نے عالمی سطح پر ہلچل مچائی۔ یہی حال دوسرے بہت سے اہم معاملات کا بھی ہے۔ ایران اور شمالی کوریا کے بارے میں ٹرمپ نے ٹھوس اقدامات کی سطح پر کچھ کرنے کے بجائے اب تک محض بڑھک سے کام لیا ہے۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرتے آئے ہیں اور باتوں ہی تک محدود رہے ہیں۔

شاید ٹرمپ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اب امریکا میں اہلیت کی وہ سطح نہیں رہی جو کسی زمانے میں تھی۔ ان کا یہ خیال ہے کہ امریکا ساری دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق بہت کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امریکی فوج کے کاندھوں پر بوجھ ضرورت اور گنجائش سے کہیں زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ بیشتر اہم معاملات میں پالیسی سازوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اب پیچھے ہٹنے میں دانش مندی ہے۔ ’’فارن پالیسی‘‘ میں اسٹیفن والٹ نے لکھا ہے کہ امریکا نے دوسری جنگ عظیم کے بعد جدید علوم و فنون میں غیر معمولی پیش رفت اور برتری کی بنیاد پر دوسروں سے کہیں زیادہ فوائد بٹورے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ آج امریکا کے لیے بہت سے معاملات میں مسابقت سخت تر ہوگئی ہے۔ یورپ کے کئی ممالک امریکا کو منہ دے رہے ہیں اور اس طرف، ایشیا میں، روس اور چین امریکی مفادات کے لیے سب سے بڑے خطرے کے روپ میں ابھرے ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کی طرف اشارا کر رہا ہے کہ اب امریکا کو پسپائی اختیار کرتے ہوئے دوسری قوتوں کے لیے جگہ بنانا پڑے گی۔ اس مرحلے سے گزرنے ہی پر نئے عالمی نظام کی راہ ہموار ہوگی اور روس، چین، ترکی اور جنوبی کوریا وغیرہ مل کر امریکا کے ساتھ کسی ایسے معاہدے پر متفق ہوں گے، جس کے ذریعے سب کو اپنے حصے کا کردار ملے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"The unexceptional superpower: American grand strategy in the age of Trump".
("iiss.org". November 20, 2017)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی مطبوعات... ہر خاتون، ہر خاندان کے لیے!

قرآن کا نظامِ خاندان	30/=	اسلام کا عائلی نظام	180/=
عورت اور اسلام	150/=	مسلمان عورت کے حقوق	200/=
مسلمان خواتین کی ذمہ داریاں	40/=	خانگی زندگی اور اُسوۂ حسنہ	40/=
خاندان کو لاحق خطرات اور ممکنہ لائحہ عمل	30/=	گھریلو تشدد اور اسلام	60/=
مردوں کا جہاں اور ہے عورتوں کا جہاں اور	500/=	تحریکِ حقوقِ نسواں	200/=
بچے اور اسلام	20/=	آزاد بچے، آزاد والدین	350/=
بچوں سے گفتگو کیسے کریں؟	200/=	بچوں کو کہنا ماننا کیسے سکھائیں؟	160/=
اسلام میں بچوں کے حقوق اور تحفظ	70/=	بچوں میں خوف	150/=
بچوں کے ذہنی امراض	300/=	کھلتی کلیاں مہکتے پھول	60/=

اور دیگر بیسیوں کتابیں اور کتابچے، قاری کے لیے مفید اور کتب خانے کی زینت!

اکیڈمی بک سینٹر۔ ڈی ۳۵، بلاک ۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

ایران کی ''نرم'' قوت

Ahmad Majidyar

ایران کی جانب سے خطے کے مناقشوں میں عسکری نوعیت کا کردار ادا کرنا اور متحارب گروپوں میں سے کسی کی حمایت کرنا تو دنیا کو دکھائی دے جاتا ہے مگر وہ ''نرم'' قوت کے ذریعے اپنے نظریاتی اور سیاسی اہداف کے حصول کی جو کوشش کرتا ہے وہ کم ہی لوگوں کو دکھائی دیتی ہے۔ شام اور عراق کے متعدد شہروں میں اسلامک آزاد یونیورسٹیز کا قیام اور لبنان میں اس کی مرکزی برانچ کا قیام خطے میں اپنے اثرات کا دائرہ وسیع کرنے کی ایک اہم ایرانی کوشش ہے۔ ایران کے تعلیمی، ثقافتی اور خیراتی ادارے خطے میں ایرانی عسکری حکمت عملی کو آگے بڑھانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ ادارے کبھی کبھی، ضرورت پڑنے پر، ایران کے پاسدارانِ انقلاب کے ایجنٹس کو کور فراہم کرنے کا کام بھی کرتے ہیں اور یوں خطے کی سلامتی کو داؤ پر لگانے والی تخریبی سرگرمیوں میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ایران کے سابق وزیر خارجہ اور ملک کے سپریم لیڈر علی خامنہ ای کے مشیر برائے خارجہ پالیسی امور علی اکبر ولایتی نے بتایا ہے کہ شام کے صدر بشار الاسد نے متعدد شہروں میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں قائم کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ ایک انٹرویو میں علی اکبر ولایتی نے بتایا کہ میں نے ایک شامی شہر میں یونیورسٹی کی برانچ کھولنے کے سلسلے میں بات کی تھی مگر بشار الاسد نے تمام شامی شہروں میں شاخیں کھولنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ علی اکبر ولایتی آزاد اسلامک یونیورسٹی کی فاؤنڈنگ کونسل اور بورڈ آف ٹرسٹیز کے سربراہ ہیں۔

علی اکبر ولایتی کہتے ہیں کہ عراق کے متعدد شہروں میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں کھولنے کے حوالے سے بھی بات ہو چکی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عراقی پارلیمان کے فرسٹ ڈپٹی اسپیکر ہُمام حمودی سے بات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ عراق کی اسلامک سپریم کونسل کے سربراہ نے عراقی شہروں میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں قائم کرنے کے حوالے سے گرین سگنل دے دیا ہے۔ ہُمام حمودی کے پیش رو عمار حکیم کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کیے گئے تھے، جس کے تحت اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں کربلا، نجف، بصرہ، بغداد اور اربل میں قائم کی جائیں گی۔

اسلامک آزاد یونیورسٹی کی ایک برانچ لبنان میں کھولی جاچکی ہے۔ علی اکبر ولایتی کہتے ہیں کہ لبنان میں یونیورسٹی کے نیٹ ورک کو وسعت دی جائے گی۔ انہوں نے اس حوالے سے لبنان کی ایران نواز ملیشیا حزب اللہ کے سربراہ حسن نصراللہ سے بات کی ہے۔ حسن نصراللہ نے لبنان کی وزارت تعلیم سے اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔ اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں افغانستان اور متحدہ عرب امارات میں بھی ہیں۔

نرم قوت کے اثرات

اسلامک آزاد یونیورسٹی کے نیٹ ورک کی بیرون ملک توسیع کا بنیادی مقصد ایران کے سوفٹ امیج کو عام کرنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نظریاتی، سفارتی اور سیاسی اہداف کے حصول کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانا ہے۔ علی اکبر ولایتی کہتے ہیں کہ اسلامک آزاد یونیورسٹی کے نیٹ ورک میں توسیع سے چین، بھارت اور عرب دنیا میں اسلام کی ترویج اور بالخصوص شیعیت کی تبلیغ و ترویج کے حوالے سے خاصی مدد مل رہی ہے۔

ایرانی قیادت نے خطے میں اپنے اثرات کا دائرہ وسیع تر کرنے کے لیے اب تعلیمی، ثقافتی اور فلاحی اداروں سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ پر جوش نوجوانوں کو بھرتی کر کے انہیں ان تنظیموں اور اداروں کے ذریعے خطے کے مختلف ممالک میں تعینات کیا جاتا ہے۔ یہ نوجوان علاقائی سطح پر ایران کا اثر و رسوخ بڑھانے کے حوالے سے طے کردہ اہداف کے حصول کے لیے انتھک محنت کرتے ہیں۔

علی اکبر ولایتی نے عرب دنیا میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے گزشتہ جولائی میں ایک تقریر میں کہا تھا کہ شام، لبنان، عراق اور دیگر عرب ممالک میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخیں قائم کرنے سے ان ممالک کے زیادہ سے زیادہ نوجوانوں کو تعلیم دینا ممکن ہوگا اور یہی نوجوان مزاحمتی تحریک میں کلیدی کردار ادا کریں گے۔ ایران کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ خطے میں جہاں جہاں اس کے زیر اثر عسکری و غیر عسکری تنظیمیں کام کر رہی ہیں وہاں افرادی قوت مقامی نوجوانوں کی شکل میں میسر ہو۔ ایرانی جامعات سے تعلیم پانے والے لازمی طور پر ایرانی نظریات سے متاثر ہوں گے اور اس کے لیے اپنے دلوں میں نرم گوشہ بھی رکھتے ہوں گے۔ علی اکبر ولایتی نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اسلامک آزاد یونیورسٹی کی نظریاتی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں پاسدارانِ انقلاب کی شاخ باسج آرگنائزیشن کی موزوں اور بروقت نمائندگی ہونی چاہیے۔ تہران میں سابق امریکی سفارت خانے میں باسج آرگنائزیشن کے افسران اور طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے علی اکبر ولایتی نے اسلامک آزاد یونیورسٹی میں اسلامی ثقافت کے احیا پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلامک آزاد یونیورسٹی باسج آرگنائزیشن کے لیے ہیڈ کوارٹر کا کام کرے گی کیونکہ ثقافتی و نظریاتی اعتبار سے باسج آرگنائزیشن ہی موزوں ترین پلیٹ فارم ہے۔

پاسداران انقلاب کے لیے سویلین کور

اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ پاسداران انقلاب اور قدس فورس کے خفیہ ایجنٹس ایران کی تعلیمی، ثقافتی اور فلاحی تنظیموں اور اداروں کو سویلین کور کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ پھر چاہے ان کی سرگرمیوں سے خطے کی سلامتی ہی داؤ پر لگ جائے۔ لبنان میں ایران کا ثقافتی مرکز حزب اللہ ملیشیا سے مل کر کام کرتا ہے تاکہ ایران میں حزب اللہ کے لیے زیادہ سے زیادہ فنڈ جمع کیے جاسکیں۔ دی امام خمینی ریلیف کمیٹی فلاحی تنظیم ہے مگر یہ پاسداران انقلاب سے مل کر کام کرتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وسطی و جنوبی ایشیا سے مشرق وسطیٰ اور اس سے آگے تک ایران کے نظریاتی، سفارتی اور سیاسی مفادات کو زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کیا جائے۔

۱۹۷۹ء کے انقلاب کے بعد سے ایران نے خطے کے متعدد ممالک میں ثقافتی مرکز کھولے ہیں، جن کا مقصد بظاہر سوفٹ امیج کو فروغ دینا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ نرم قوت کے ساتھ ساتھ یہ مراکز ایران کی سخت قوت کو بھی تقویت بہم پہنچانے میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں ایران نے لبنان کے دارالحکومت بیروت میں اپنا ثقافتی مرکز قائم کیا۔ اس کا ایک بنیادی مقصد حزب اللہ ملیشیا کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت سے ہمکنار کرنا اور اس سے کہیں بڑھ کر ایران کو لبنان اور خطے کے دیگر شیعہ عوام کے لیے شیعیت کے ''ویٹیکن'' کے طور پر پیش کرنا تھا۔

بیروت میں قائم ایرانی ثقافتی مرکز شیعہ اکثریت والے علاقوں میں اسکولوں، جامعات اور مذہبی مدارس کے ایک پورے سلسلے کا مہتمم و نگران ہے۔ یہ ثقافتی مرکز ایران کے سرکاری میڈیا کے اشتراک سے ایرانی نظریات کی تبلیغ بھی ممکن بناتا ہے۔

علی اکبر ولایتی نے ایک عشرے سے بھی زائد مدت تک وزیر خارجہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ایران کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے ان کی خدمات غیر معمولی رہی

ہیں۔وہ ایران کی انقلابی کونسل کے ساتھ ساتھ ایرانی انقلاب کی سپریم کونسل کے بھی رکن ہیں۔ساتھ ہی ساتھ وہ سینٹر فار اسٹریٹجک ریسرچ کے سربراہ بھی ہیں۔یہ دونوں ادارے ایران کا نظریاتی ایجنڈا برآمد کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ان کے علاوہ علی اکبر ولایتی مزید بیس ریاستی اداروں میں مختلف حیثیتوں سے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

اسلامک آزاد یونیورسٹی

ایران کے سابق سپریم لیڈر خمینی نے ۱۹۸۲ء میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا تھا۔ایران میں اور ایران سے باہر اس کی ۳۰۰ سے زیادہ شاخیں ہیں۔اس سے مستفید ہونے والے طلبہ وطالبات کی مجموعی تعداد دس لاکھ سے زائد ہے۔لبنان میں اس یونیورسٹی کی شاخیں بیروت اور النباطیہ میں ہیں۔افغانستان میں اس کی برانچ مغربی کابل میں ہے، جہاں شیعہ ہزارہ کمیونٹی کی اکثریت ہے۔کابل میں اسلامک آزاد یونیورسٹی کی شاخ ایرانی امداد سے چلنے والی خاتم النبیین یونیورسٹی کے نزدیک واقع ہے۔ خاتم النبیین یونیورسٹی افغانستان کے شیعہ لیڈر آصف محسنی نے قائم کی ہے اور وہی چلا رہے ہیں تاہم اس کے چلانے والوں کی تربیت ایران میں ہوتی ہے اور اس کا کتب خانہ ایران کی فراہم کردہ کتب سے بھرا ہوا ہے۔افغانستان کی طرح عراق اور شام بھی جنگ سے تباہ ہو چکے ہیں۔ ایسے میں ایران کے لیے وہاں جامعات کا جال بچھانا آسان ہے۔افغانستان میں وہ اپنا کام کر چکا ہے۔اب عراق اور شام پر توجہ دی جا رہی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایران کی وزارت خفیہ امور اور سپریم نیشنل سیکورٹی کونسل نے ماضی میں عراق کے باشندوں کو ایرانی حدود میں اسلامک آزاد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے سے روک دیا تھا۔

امریکا اور اس کے اتحادی سخت قوت کے معاملے میں تو ایران کے اقدامات پر نظر رکھتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرنے کی سعی بھی کرتے ہیں، مگر جب تک نرم قوت میں اضافے سے متعلق ایرانی پالیسی کو نہیں سمجھیں گے اور متعلقہ اقدامات کا مقابلہ نہیں کریں گے تب تک ایران کی سخت قوت میں اضافے کے عمل کو روکنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

(احمد ماجد یار دی مڈل ایسٹ انسٹی ٹیوٹ کے ایران آبزروڈ پراجیکٹ کے فیلو اور ڈائریکٹر ہیں۔)

"Iran's soft power: Islamic Azad University opening branches in major Syrian and Iraqi cities ". ("Middle East Institute ". Jan.17, 2018)

افریقی وسائل اور نقل مکانی

Lorenzo Kamel

یورپ نے نقل مکانی روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا ہے۔اس سے کہیں زیادہ معاشی استحصال کی پالیسی پر عمل روکنے کی ضرورت ہے۔افریقا سے نقل مکانی کا رجحان اس لیے پروان چڑھا ہے کہ اس براعظم کے وسائل کا بلادریغ استحصال کیا جا رہا ہے۔لازم ہوگیا ہے کہ یہ رجحان روکا جائے۔

۱۷؍جنوری کو اطالوی پارلیمنٹ نے ۴۷۰ فوجی افریقی ملک نائیجر میں تعینات کرنے کی منظوری دی۔ اس اقدام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ نائیجر کے باشندوں کو لیبیا جانے سے روکا جاسکے۔لیبیا سے یہ لوگ یورپ کی راہ لیتے ہیں۔فرانس، جرمنی اور اسپین نے بھی ایسے ہی اقدامات کیے ہیں۔افریقا سے یورپ کی طرف نقل مکانی روکنے کے لیے ان یورپی طاقتوں کو اور کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا۔

افریقا سے نقل مکانی روکنے کے لیے طاقت کا استعمال انوکھا یا راتوں رات رونما ہونے والا واقعہ نہیں۔یورپ میں اس حوالے سے بہت سوچا گیا ہے۔ بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ تھنک ٹینک کی سطح پر تجاویز مرتب کی گئی ہیں۔کوشش کی جارہی ہے کہ فی الحال طاقت کے ذریعے افریقی آبادی کو یورپ کی طرف آنے سے روکا جائے۔حکومتوں نے اہلِ دانش کی آراء کی روشنی میں چند ایک اقدامات کیے ہیں۔اور ان اقدامات کے ملے جلے نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

افریقا سے یورپ کی طرف نقل مکانی میں ایک طرف تو این جی اوز کا کردار ہے اور دوسری طرف منظم جرائم کے گروہ بھی فعال ہیں۔ یہ سب کچھ ایک منظم نیٹ ورک کے ذریعے ہو رہا ہے۔

یورپ نے افریقیوں کو ان کے گھروں تک محدود رکھنے کے حوالے سے اب تک جو اقدامات کیے ہیں وہ ان کی دانست میں درست ہی ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے دوررس اور مثبت اثرات رونما ہوتے دکھائی نہیں دیتے۔ افریقی ممالک میں معیشت کا ڈھانچا کچھ اس طرح کا ہے کہ لوگ مجبور ہوکر دیگر ترقی یافتہ خطوں کی طرف دیکھتے اور لپکتے ہیں۔قدرتی وسائل کو بہتر انداز سے بروئے کار لانے کا باقاعدہ نظام موجود نہیں۔سیاسی استحکام برائے نام ہے۔سیاسی تبدیلیوں کے نام پر قتل وغارت کا بازار گرم رہتا ہے۔ایسے میں لوگ ملک سے نکل بھاگنے کو بے تاب دکھائی دیتے ہیں۔

یورپی طاقتیں افریقا سے نقل مکانی روکنے کے لیے جو کچھ کر رہی ہیں وہ قلیل المیعاد بنیاد پر تو چند ایک اثرات کا حامل ہوسکتا ہے مگر طویل مدتی بنیاد پر ایسا کرنے کے فوائد نہ ہونے کے برابر ہیں۔افریقا میں موجودہ اور آنے والی نسلوں کو معیشتی، سیاسی اور معاشرتی ساخت کے اعتبار سے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت ہے۔ایسا کچھ نہیں کیا جا رہا اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہیں ہوگا مرضی کے نتائج بھی برآمد نہیں ہوں گے۔

افریقا کے کئی ممالک تیل اور گیس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ان میں نائیجیریا سب سے نمایاں ہے۔نائیجیریا میں تیل کے ایک بڑے بلاک میں مجموعی طور پر کم و بیش ۹؍ارب بیرل تیل موجود ہے، یہ بلاک ساحلی علاقے میں ہے۔یہ وہی علاقہ ہے جہاں سے پندرہویں صدی عیسوی میں ایک کروڑ بیس لاکھ غلاموں کو امریکا لے جایا گیا تھا اور یہیں سے سب سے زیادہ لوگوں نے ۲۰۱۶ء میں نقل مکانی کرکے اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھا۔نائیجیریا افریقا میں آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے۔

یورپ سے تعلق رکھنے والی تیل اور گیس کی کمپنیوں نے نائیجیریا سے تیل اور گیس کے حصول کے لیے اربوں ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ نائیجیریا میں صحتِ عامہ کے حوالے سے بہت سے مسائل ہیں۔اگر یورپی طاقتیں تیل حاصل کرنے کے لیے خرچ کی جانے والی رقم کا بہت تھوڑا سا حصہ بھی صحتِ عامہ پر خرچ کریں تو نائیجیریا میں لوگ سکون کا سانس لیں اور انہیں اپنی ہی سرزمین پر زندگی بسر کرنے میں کچھ زیادہ قباحت محسوس نہ ہو۔ باضابطہ ریاستی ڈھانچا اور شفافیت نہ ہونے کے باعث تیل اور گیس کے سودوں سے عوام کو کچھ نہیں ملتا۔یورپی آئل کمپنیاں جو ڈیل کرتی ہیں ان کے نتیجے میں چند بیوروکریٹس اور سیاست دانوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔چند ایک منی لانڈرز بھی اس سیٹ اپ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔نائیجیریا کے عوام کی زندگی میں ان سودوں سے کوئی بڑی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ بڑے ممالک کے ادارے غریب ممالک کے قدرتی وسائل کو ہڑپ کر رہے ہیں۔او پی ایل ۲۴۵ (نائیجیریا) آئل بلاک ہے، یعنی وہ

علاقہ جہاں تیل مرتکز ہے۔ پاناما پیپرز سے یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ امریکا اور یورپ کے بڑے اداروں کے لیے کام کرنے والے بہت سے اداروں نے افریقا اور بحیرۂ روم کے کنارے آباد غریب ممالک کے قدرتی وسائل کی بندر بانٹ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ایندھن، سونا اور گیس اس طور نکالا گیا ہے گویا لوٹا جا رہا ہو۔

عام تصور یہ ہے کہ یورپ بہت فراخ دل ہے اور بہت سے غریب اور تباہ حال ممالک کے لوگوں کو پناہ گزینوں کی حیثیت سے قبول کر رہا ہے۔ یہ تاثر یا تصور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ یورپ اگر لاکھوں پناہ گزینوں کے مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کی جانی چاہیے کہ اس مسئلے کو پروان چڑھانے میں خود یورپ ہی نے کلیدی کردار بھی ادا کیا ہے۔ چند دیگر مسائل سے نمٹنے کے لیے بھی توجہ درکار ہے۔

یورپ کو افریقا کے غریب ممالک کی بھرپور مدد کے لیے آگے آنا ہوگا۔ ایک طرف تو یورپی یونین کو اپنی منڈیاں افریقی مال کے لیے کھولنا ہوں گی اور دوسری طرف افریقا کے خام مال کو بٹورنے سے گریز کرنا ہوگا۔ افریقا سے جو فوائد یورپ نے بٹورے ہیں، ان کے فوائد افریقی آبادیوں کو دینا ہوں گے۔ کروڑوں افراد انتہائی پس ماندگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ معیشتوں کی ساخت تبدیل کرکے ترقی کی راہ ہموار کرنا ہوگی تاکہ عمومی معیارِ زندگی بلند ہو اور لوگ بہتر انداز سے جینے کے قابل ہوسکیں۔ افریقا کے انتہائی پسماندہ ممالک کی پائیدار ترقی یقینی بنانے پر سب سے زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔

افریقا اور بالخصوص شمالی افریقا کے عوام کو بہتر زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرنے میں متمول عرب ریاستیں بھی اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ اس حوالے سے سعودی عرب، قطر، کویت، متحدہ عرب امارات اور بحرین وغیرہ کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

شام اور یمن میں جاری لڑائی کو روکنے کے لیے عرب ممالک کو اپنا کردار بھرپور طریقے سے ادا کرنا ہوگا۔ یورپ سے اسلحے کی کھیپیں اس خطے میں بھیجی جارہی ہیں۔ بلقان کا خطہ اس حوالے سے نمایاں ہے۔ اگر شام اور یمن میں لڑائی کو روکنا ہے اور خطے کو حقیقی معنوں میں پرامن بنانا ہے تو لازم ہے کہ سعودی عرب، کویت اور دیگر متمول اور بااثر ممالک اپنا کردار ادا کریں۔ جب تک ان دونوں ممالک میں لڑائی ختم نہیں ہوگی تب تک نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں بھی کمی واقع نہیں ہوگی۔

نائن الیون کے بعد جارج بش جونیئر نے انتہائی ناانصافی کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان اور عراق کو نشانہ بنایا اور دونوں ممالک کو تباہی سے دوچار کردیا۔ تب سے اب تک دونوں ممالک میں دہشت گردی کا سلسلہ تھما نہیں ہے۔ افغانستان پہلے ہی تباہ حال تھا۔ نائن الیون کے بعد اس کی تباہی کا دائرہ پھیل گیا۔ دوسری طرف عراق مجموعی طور پر پرسکون ملک تھا مگر جارج بش جونیئر نے یورپ کے ساتھ مل کر اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہنستا کھیلتا ملک کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔ عراق کی تباہی سے لیبیا کی تباہی کی راہ بھی ہموار ہوئی اور یوں مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام کا دائرہ پھیل گیا۔ ساتھ ہی ساتھ شمالی افریقا میں بھی خرابیوں کا آغاز ہوا۔

ساخت کی تبدیلی ناگزیر

افریقا میں پسماندگی اور خرابی بہت زیادہ ہے۔ یورپ چونکہ جڑا ہوا خطہ ہے اس لیے آنے والے برسوں میں نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ اس وقت افریقا کی آبادی ایک ارب بیس کروڑ ہے۔ ۲۰۵۰ء تک افریقا کی آبادی ڈھائی ارب تک پہنچے گی۔ اگر پسماندگی دور نہ کی گئی اور معیشتوں کو مستحکم کرنے پر توجہ نہ دی گئی تو افریقا سے یورپ کی طرف نقل مکانی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یوں انسانی المیے جنم لیتے رہیں گے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ یورپ میں شرح پیدائش گھٹتی جارہی ہے۔ بیشتر یورپی اقوام کو گھٹتی ہوئی آبادی کے مسئلے کا سامنا ہے۔ شمالی افریقا سے آنے والوں کو روکنے کے لیے یورپ کو زیادہ سے زیادہ طاقت استعمال کرنا ہوگی۔ یہ سب کچھ ایسا آسان نہیں جیسا سوچا اور کہا جارہا ہے۔ یورپ کو سب سے پہلے تو افریقا کے قدرتی وسائل کی بندر بانٹ روکنا ہوگی۔ اس وقت یورپ کے بہت سے ادارے افریقی قدرتی وسائل کو آنکھ بند کرکے بٹور رہے ہیں۔ اس کے نتیجے میں افریقا کے لوگوں میں یہ احساس جنم لے رہا ہے کہ جنہوں نے ہمارا برا حال کیا ہے اُنہی کی طرف نقل مکانی کی جانی چاہیے۔ یورپ کو افریقا میں زیادہ سے زیادہ سرمایہ کاری کرنی چاہیے اور دوسری طرف یورپی منڈیاں افریقی مال کے لیے کھولنی چاہئیں تاکہ افریقی معیشتیں خاطر خواہ حد تک پنپ سکیں۔ جب افریقا میں معیشتیں مضبوط ہوں گی اور لوگوں کو بہتر زندگی بسر کرنے کے مواقع ملیں گے تو وہ کہیں بھی جانے سے گریز کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ یورپ کو یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا میں جنگ سے تباہ حال ممالک میں اسلحے کی فراہمی جاری نہ رہے۔ بالخصوص یمن میں متحارب دھڑوں کو اسلحے کی فراہمی روکنا ہوگی۔ افریقا سے ہر سال لاکھوں افراد موسم کی تبدیلی کے باعث بھی یورپ کی طرف نقل مکانی کرتے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے ۶/۱ ارب یورو مختص کیے گئے ہیں۔ یہ فنڈ قانونی طریقے تلاش کرنے پر خرچ کیے جانے چاہئیں۔ معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹانے کی ضرورت ہے اور یہ کہ معاملہ کرائسز مینجمنٹ سے ایک قدم آگے بڑھ کر کرائسز پریوینشن کا ہے۔ افریقا سے آنے والوں کو روکنے کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ یورپ کی طرف نہ آئیں۔ یعنی انہیں ان کے گھر میں بہترین امکانات سے ہمکنار کیا جائے۔

ایک بڑا اور بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یورپ کے مقابلے میں مشرق وسطیٰ اور افریقا کو انتہائی پسماندہ اور وحشی معاشرے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ اگر کوئی خطہ پیچھے رہ گیا ہے تو اسے پسماندگی کا طعنہ دینے کے بجائے اس کی مدد کی جانی چاہیے۔ انہیں وحشی اور جاہل قرار دینے سے معاملات صرف بگڑیں گے۔ اس حوالے سے سوچ تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ باصلاحیت خطوں کی زیادہ سے زیادہ مدد کی جانی چاہیے تاکہ وہ بھی عالمی سطح پر ترقی کے عمل کا حصہ بن سکیں اور اس دنیا کو زیادہ سے زیادہ قابلِ سکونت بنانے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔ یورپ کو الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی ترک کی جانی چاہیے۔ یورپ نے فقید المثال ترقی کی ہے تو بہت کچھ بھلا بھی دیا گیا ہے۔ یہ تاثر دیا جارہا ہے جیسے یورپ ہزاروں سال سے ایسا ہی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ مشرق وسطیٰ اور افریقا کے متعدد ممالک بھی علم و فن میں آگے رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یورپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا اور مشرق وسطیٰ علم و فن کے حوالے سے موثر تھا۔ اس حقیقت کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ پانچ سو سال پہلے یورپ بھی جہل کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ یورپ کے لوگوں کو اپنا رویہ بدلنا ہوگا۔ انہیں یہ سوچتے رہنے سے گریز کرنا ہوگا کہ وہ بہت برتر ہیں اور باقی سب کمتر اور جاہل ہیں۔ کمزور خطوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے وقت انہیں یاد رہنا چاہیے کہ وہ خود بھی کسی زمانے میں ایسے ہی تھے۔ اور یہ کہ اُس زمانے کو گزرے ہوئے ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"To stop migration, stop the abuse of Africa's resources". ("aljazeera.com". Feb.15, 2018)

بھارت میں کوئی اقلیت محفوظ نہیں!

Harsh Mander

کرسمس کے موقع پر مدھیہ پردیش کے شہر ستنا میں ۳۲ پادریوں اور دیگر عیسائیوں سے غیر معمولی زیادتی رونما ہوئی۔ انتہا پسند ہندو تنظیم بجرنگ دل کے کارکنوں نے کرسمس کیرول گانے پر انہیں تشدد کا نشانہ بنایا اور پھر پولیس نے انہی کے خلاف مقدمہ بنا کر انہیں لاک اپ کر دیا۔ بجرنگ دل کے کارکنوں نے ان کی گاڑیاں بھی جلا دیں اور معاملہ یہیں تک نہیں رکا۔ انہیں حراست میں بھی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس نے تمام عیسائیوں پر جبری مذہب تبدیل کرانے کا مقدمہ درج کرایا۔ حملہ آوروں کو کچھ بھی نہیں کہا گیا۔ کسی نے انہیں ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اسی دوران ہندو جاگرن منچ نے علی گڑھ کے کرسچین اسکولوں کو خبردار کیا کہ اگر اس کے طلبہ نے کرسمس منانے کی کوشش کی تو نتائج کے خود ذمہ دار ہوں گے! اتر پردیش کے کئی دوسرے شہروں سے بھی ایسی ہی دھمکیوں کی اطلاعات موصول ہوئی ہیں۔

میرا گھرانہ بھی کرسمس کی خوشیوں میں عیسائیوں کے ساتھ شریک ہوتا رہا ہے۔ ہم لوگ کرسمس کی خوشی میں اس کے پیغام کی بنیاد پر شریک ہوتے ہیں۔ مگر اب ماحول کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ کسی کو میری کرسمس کہنا بھی انتہائی خطرناک ہے۔ بھارت بھر میں مذہبی بنیاد پر عدم برداشت اس قدر بڑھ رہا ہے کہ کرسمس کیرول گانا اور کرسمس کا کیک کاٹنا بھی انتہائی خطرناک ہوگیا ہے۔ ایسے ماحول میں مذہبی رواداری کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ میں نے دسمبر میں احتجاج اور یکجہتی دونوں کے اظہار کے لیے ”کرسمس ماس“ میں شرکت کی۔

بھارت اب اپنی مسلم اور عیسائی دونوں اقلیتوں کے لیے غیر محفوظ تر ہوتا جارہا ہے۔ ۲۰۱۷ء میں دی ورلڈ واچ لسٹ نے بھارت کو اقلیتوں کے لیے پندرہویں خطرناک ترین ملک کی حیثیت سے شناخت کیا۔ چار سال قبل بھارت اکتیسویں نمبر پر تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت میں اقلیتوں سے کیسا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔ مسلمانوں پر ایک طرف تو انتہا پسند ہندو حملے کر رہے ہیں اور دوسری طرف پولیس ان کی ٹارگٹ کلنگ کر رہی ہے۔ عیسائیوں پر بھی گرجوں اور اجتماعی دعا کی تقریبات میں حملے کیے جارہے ہیں۔ پادریوں اور راہباؤں کو نشانہ بنایا جارہا ہے۔ دی یونائیٹڈ کرسچین فورم نے ۲۰۱۷ء میں عیسائیوں پر ۲۱۶ حملے رپورٹ کیے ہیں۔ پولیس نے ان میں سے صرف ایک چوتھائی واقعات کی رپورٹ درج کی۔ گرفتار کیے جانے والے حملہ آوروں کی تعداد برائے نام ہے۔ ان میں سے نصف سے زائد حملے چھتیس گڑھ، تامل ناڈو، مدھیہ پردیش اور اتر پردیش میں ہوئے۔ کرسچین کمیونٹی کے معاشی اور معاشرتی بائیکاٹ کی اطلاعات بھی ملی ہیں۔ ملازمت کے مواقع چھیننے کے ساتھ ساتھ انہیں پانی اور بجلی تک رسائی سے بھی روکا جارہا ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی اور سنگھ پریوار کے دیگر انتہا پسند ہندو گروپ ایک زمانے سے پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ بھارت کے طول وعرض میں نچلی ذات کے، معاشی طور پر کچلے ہوئے ہندوؤں اور آدی واسیوں کو دولت کے بل پر عیسائی بنایا جارہا ہے۔ اس پروپیگنڈے نے ایک امن پسند کمیونٹی کے خلاف شدید نفرت ابھارنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ گرجوں، دعائیہ تقریبات اور مزارات وغیرہ پر حملوں کی شکل میں برآمد ہوا ہے۔

گلوبل ہندو ہیریٹیج فاؤنڈیشن نے امریکی ریاست ٹیکساس میں ۲۰۱۵ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کے مندرجات ملاحظہ فرمایئے: ”بھارت میں صرف عیسائی ہی نہیں، بہت سے ہندو بھی عیسائیت کے بارے میں جانے اور سوچے بغیر کرسمس مناتے ہیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں کہ عیسائیت کیا ہے، یہ بت پرستی کے بارے میں کیا کہتی ہے، اس نے کتنی تہذیبوں کو بربادی سے دوچار کیا ہے، کتنے ہندوؤں کا مذہب تبدیل کر کے انہیں اپنے ہی مذہب کے مخالف کھڑا کر دیا ہے اور یہ کہ ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے لیے کہاں کہاں سے فنڈ آرہے ہیں۔ عیسائیوں میں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ یسوع مسیح نے انہیں دھوکا دینے، مذہب تبدیل کرانے، کسی بھی قوم پر چڑھ دوڑنے اور اسے فتح کرنے کے بعد تباہی سے دوچار کرنے کا اختیار دے رکھا ہے۔ بھارت کی جنوبی ریاستوں میں ہندوؤں کو عیسائی بنانے کا عمل بہت تیز ہے۔ وہاں ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے بعد ہندو ازم کے خلاف کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ دیوی دیوتاؤں کے بتوں کو توڑنے اور ان کی تصاویر پھاڑنے کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ آندھرا پردیش کے بارے میں اطلاعات ہیں کہ دیہات میں رہنے والے کم و بیش ۳۰ فیصد ہندو عیسائیت قبول کر چکے ہیں۔“

اِسے کہتے ہیں چور مچائے شور۔ اس پروپیگنڈے کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ بھارت میں کئی عشروں کے دوران عیسائیوں کی تعداد ملک کی مجموعی آبادی کے ڈھائی فیصد سے زائد نہیں ہوسکی ہے۔ اگر بہت بڑے پیمانے پر تبدیلیٔ مذہب کا معاملہ ہوتا اور ہندو نمایاں تعداد میں عیسائیت قبول کر رہے ہوتے تو اعداد و شمار کی شکل میں اس کا اثر ضرور ظاہر ہوتا۔ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ بھارتی سرزمین پر عیسائی یورپ میں عیسائیت کے پھیلنے سے ایک ہزار سال پہلے آئے تھے اور یہاں برطانوی راج کی صدیوں کے دوران بھی رہے۔ اتنی طویل مدت کے دوران جب عیسائیوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ نہ ہوسکا تو اب ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟

سینئر ایڈووکیٹ راجیو دھون کہتے ہیں کہ انتہا پسند ہندو عیسائیوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف پروپیگنڈا اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ بھارت کو خالصاً ہندو ریاست قرار دلانے کے لیے سرگرم ہیں۔ اس نکتے پر بھی زور دیا جارہا ہے کہ ماضی میں مذہب تبدیل کرنے کے تمام واقعات زبردستی، لالچ یا خوف کا نتیجہ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مستقبل میں مذہب کی تبدیلی کے واقعات کم سے کم ہوں۔

راجیو دھون کہتے ہیں کہ مذہب کی تبدیلی کے حوالے سے مچایا جانے والا شور بلاجواز اور ہندوتوا کے فروغ کی علامت ہے۔ بھارت بھر میں انتہا پسند اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ بھارت کو خالص ہندو ریاست قرار دیا جائے اور دیگر تمام مذاہب کے لیے شدید عدم برداشت کی فضا پروان چڑھائی جائے۔ انتہا پسند ہندو چاہتے ہیں کہ ہندو دیگر مذاہب کی طرف نہ جائیں یعنی مذہب تبدیل نہ کریں اور اس سے ایک قدم آگے جاکر دیگر مذاہب کو برداشت کرنے کا رویہ بھی ترک کریں۔ یہ سب کچھ ہوگا تب ہی ہندوتوا کے ایجنڈے کی تکمیل ہوگی۔ راجیو دھون مزید کہتے ہیں کہ بابری مسجد کی شہادت، آسٹریلوی پادری گراہم اسٹینز اور ان کے بچوں کا بہیمانہ قتل اور اسی نوعیت کے دیگر واقعات خوف کی ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش ہیں، جس میں بھارتی سرزمین پر دیگر مذاہب کے پنپنے کی گنجائش کم سے کم رہ جائے اور عام ہندو کسی بھی مذہب کو قبول کرتے وقت شدید خوف میں مبتلا ہوں۔ ساتھ ساتھ اقلیتوں کو ڈرانے، دھمکانے کے لیے قانونی طریقوں کا بھی سہارا لیا جارہا ہے۔ ایسے قوانین تیار کیے جارہے ہیں، جن کی

مدد سے مذہب کی تبدیلی کوئی آسان عمل نہ رہے گی۔

مذہب کی تبدیلی کے حوالے سے ہمارے ہاں بحث اتنی تلخ ہوچکی ہے کہ یہ بنیادی حقیقت بھی نظرانداز کردی گئی ہے کہ آئین نے ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل ہی کا نہیں بلکہ اس کی تبلیغ کا حق بھی دیا ہے۔ راجیو دھون کہتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے بھارت مذہب تبدیل کرنے والوں کا ملک ہے۔ بھارت کے اصل باشندوں نے جین ازم کو قبول کیا۔ پھر بدھ ازم کی باری آئی۔ اس کے بعد اسلام اور عیسائیت نے سیٹ سنبھالی۔ اس پورے عمل نے بھارت کو منفرد حیثیت عطا کی ہے۔ آج بھارت کا مسلم یا عیسائی محض مسلم یا عیسائی ہے، سابق ہندو نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے تو اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اسے پولیس سے رابطہ کرنے یا کسی مجسٹریٹ کی نگرانی میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں قانون بھی کچھ نہیں کرسکتا۔

بھارت کا آئین ہر شخص کو کسی بھی مذہب سے وابستہ ہونے کا حق دیتا ہے۔ آئین ساز اسمبلی میں ایم رتناسوامی نے آرٹیکل ۲۵ میں لفظ ''پروپیگیٹ'' شامل کرنے کی بھی تجویز پیش کی تھی، جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی شخص کو اظہار رائے کی آزادی کے تحت اپنے مذہب کی بھرپور تبلیغ کا حق بھی حاصل ہوگا۔

انتہا پسند گروپوں کی سرپرست تنظیم سنگھ پریوار نے شور مچا رکھا ہے کہ ہندوؤں کو دولت اور خوف کی بنیاد پر دوسرے مذاہب کی طرف دھکیلا جارہا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے کا بنیادی آئینی حق چھین لیا جائے۔ کئی ریاستوں میں مذہب کی تبدیلی کے خلاف قوانین لائے گئے ہیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے یعنی ہندوؤں کو دیگر مذاہب کی طرف جانے سے روکا جائے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کے لیے ڈرانے، دھمکانے سے بھی گریز نہیں کیا جارہا۔ مذہب کی تبدیلی کے خلاف بنائے جانے والے قوانین آئین سے براہِ راست متصادم ہیں۔ ایسے قوانین ان ریاستوں میں اپنائے گئے ہیں جہاں کانگریس کی حکومت نہیں۔ کانگریس کی حکومت والی ریاستوں میں گائے کے ذبیحے پر پابندی اور اسی نوعیت کے دیگر قوانین لائے گئے ہیں جبکہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لعل نہرو ایسے قوانین کے سخت مخالف تھے۔ اڑیسہ نے ۱۹۶۷ء میں سوتنتر پارٹی کی حکومت کے تحت مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا۔ اگلے ہی سال مدھیہ پردیش میں ایک ایسی مخلوط حکومت نے مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا جس میں جن سنگھ بھی شامل تھی۔ جن سنگھ ہی بعد میں بھارتیہ جنتا پارٹی میں تبدیل ہوئی۔ بی جے پی کے تحت گجرات میں ۲۰۰۳ء اور چھتیس گڑھ میں ۲۰۰۶ء میں مذہب تبدیل کرنے کے خلاف قانون لایا گیا۔ تامل ناڈو میں جیہ للتا کی حکومت نے ۲۰۰۲ء میں مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا تاہم دو ہی سال بعد اس میں ترمیم کردی۔ کانگریس کے تحت مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کرنے والی واحد اسمبلی ہماچل پردیش کی ہے، جس نے یہ ''کارنامہ'' ۲۰۰۶ء میں انجام دیا۔ ۲۰۰۶ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت میں راجستھان اسمبلی نے مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا مگر گورنر نے اس پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ ۱۹۷۸ء میں اروناچل پردیش میں پیپلز پارٹی آف اروناچل پردیش کی حکومت نے مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا تاہم یہ کبھی نافذ نہیں کیا جاسکا۔ ۲۰۱۷ء میں جھاڑکھنڈ میں بی جے پی کی حکومت کی تحت اسمبلی نے مذہب کی تبدیلی کے خلاف قانون منظور کیا ہے۔

مذہب کی تبدیلی کے خلاف قوانین بہت سی ریاستوں میں نافذ ہیں تاہم ان ریاستوں میں اس حوالے سے زیادہ activism دکھائی دیتا ہے جہاں بی جے پی کی حکومت ہے۔ اس قانون کے تحت کسی کو مجرم قرار دینے کا عمل تو خال خال دکھائی دیتا ہے تاہم ہر ماہ چند ایک مقدمات ضرور درج کیے جاتے ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جو لوگ مذہب تبدیل کریں اور کرائیں انہیں ایک خاص قانونی عمل کے ذریعے سزا دی جائے تاکہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھنے والے دوسرے پریشان ہوں اور باز رہیں۔ اس وقت اقلیتوں کے خلاف جو فضا پائی جارہی ہے، اس میں مذہب کی تبدیلی سے متعلق قوانین کو محض اس لیے بروئے کار لایا جارہا ہے کہ عیسائی برادری کو زیادہ سے زیادہ خوفزدہ کیا جائے، تبلیغی سرگرمیوں سے روکا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، مذہب کی تبدیلی کی طرف مائل ہونے والوں کی راہ مسدود کی جائے۔ کوشش یہ کی جارہی ہے کہ شدید خوف کی فضا میں کوئی بھی مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں نہ سوچے یعنی کوئی بھی ہندو عیسائیت یا اسلام کی طرف نہ جائے۔ ہاں، کوئی ہندوازم کی طرف آتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ مذہب کی تبدیلی سے متعلق قوانین کا بنیادی مقصد عیسائی برادری کے خلاف زیادہ سے زیادہ مقدمات قائم کرکے انہیں پریشان اور ہراساں کرنا ہے۔ گزشتہ اگست میں جھاڑکھنڈ کی حکومت نے اخبارات میں مکمل صفحے کا ایک اشتہار شائع کیا، جس میں وزیر اعلیٰ کا پیغام بھی شامل تھا۔ اس اشتہار میں مذہب کی تبدیلی سے متعلق گاندھی جی کا ایک بیان غلط سیاق و سباق میں پیش کیا گیا۔ ۲۰۱۷ء میں تین مواقع پر مدھیہ پردیش میں ریلوے پولیس نے کرسچین کیمپس میں جانے والے عیسائی بچوں کو محض اس خدشے کی بنیاد پر حراست میں لیا کہ انہیں مذہب تبدیل کرنے کے لیے لے جایا جارہا ہے۔ ۲۲/اور ۲۳/مئی کو ناگپور کے بائبل سمر کیمپ میں شرکت کے لیے جانے والے ۳۷ عیسائی بچوں کو ان کے نگرانوں سمیت تحویل میں لیا گیا۔ ۳ جون کو ستنا ریلوے اسٹیشن پر ایک راہبہ اور چار لڑکیوں کو تحویل میں لیا گیا۔ ۲۱/اکتوبر کو سات بچوں اور ان کے دو نگرانوں کو تحویل میں لیا گیا اور بچوں کو ان کے والدین سے بھی ملنے نہیں دیا گیا۔

سنگھ پریوار کہتا ہے کہ اسلام اور عیسائیت دونوں ہی بیرونی مذاہب ہیں اور ان کے ماننے والوں کے لیے لازم ہے کہ ہندوازم اور بھارت دونوں کے لیے وفاداری ثابت کریں۔ سنگھ پریوار کے نزدیک ہندوازم اور بھارت ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ دوسری طرف گاندھی جی کا کہنا تھا کہ اسلام اور عیسائیت بھی اُتنے ہی بھارتی مذاہب ہیں، جتنے ہندوازم، جین ازم، بدھ ازم اور سکھ ازم ہیں۔

ہم ہولی، دیوالی اور گرو پورب کی طرح کرسمس اور عید بھی مناتے آئے ہیں۔ تمام مذاہب کا احترام ایک قابل قدر جذبہ ہے۔ یہ میرا حق ہے اور مجھ سے یہ کسی طور برداشت نہ ہوگا کہ کوئی مجھ سے میرا حق چھینے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Creeping fear: Not just Muslims, India is also failing its Christian minority".
("scroll.in". Jan.22, 2018)

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین و حضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضاکارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

وسط ایشیا میں روسی استعمار۔۔۔ایک تاریخی جائزہ

محمد شفیع بٹ

مسلم دنیا عہدِ وسطیٰ سے جدید دور تک

عہدِ وسطیٰ میں اسلام کے تابناک عروج کے بعد مسلمانوں میں فکری اور علمی زوال شروع ہوگیا تھا۔ ایک طرف فلسفی اور کلامی مُشگافیاں تو دوسری طرف تقلید پسندی کی روش مسلمانوں میں عام ہورہی تھی۔ امام غزالیؒ اور علامہ ابن تیمیہ نے اگرچہ اپنے اپنے ادوار میں مسلمانوں میں علمی وفکری بیداری کی موثر تحریکیں شروع کی تھیں، مگر پھر بھی مسلمانوں میں وہ قرونِ اولیٰ جیسی علمی تڑپ اور فکری عظمت پوری طرح بحال نہ ہوسکی۔ اگرچہ زوالِ بغداد اور منگولی حملوں کے باوجود بھی مسلمانوں میں سیاسی اقتدار قائم رہا، مگر مسلمانوں نے علوم وفنون میں جو کارنامے انجام دیے تھے وہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ جبکہ دوسری طرف مغرب جو اوائل عہدِ وسطیٰ تک گھپ اندھیرے میں تھا، وہاں پر عیسائیوں میں فکری نشاۃ ثانیہ کا آغاز ۱۶ ویں صدی عیسوی کے اوائل سے ہی شروع ہوچکا تھا۔ جب مغرب اپنی مذہبی اور فکری نشاۃ ثانیہ میں آگے بڑھ رہا تھا تب اگرچہ مسلم دنیا میں تین بڑی سلطنتیں قائم تھیں، جن کو اپنی عسکری برتری کی وجہ سے (The Gun Powder Empires) کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا تھا، جن میں سب سے بڑی طاقت تو خلافتِ عثمانیہ تھی، جو دنیا کے تین بڑے براعظموں، ایشیا، افریقا اور یورپ میں برسرِ اقتدار تھی، ایران میں بھی صفویوں کی طاقتور حکومت قائم تھی اور برصغیر میں دہلی سلطنت کے بعد مغلیہ سلطنت بھی اپنے عروج پر تھی، اس سیاسی اور عسکری برتری کے باوجود بھی مسلمانوں میں فکری اور علمی جمود قائم ہوگیا تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں کی اخلاقی وسماجی اور فکری حالت کی پسماندگی کے ساتھ ساتھ سیاسی زوال بھی شروع ہوچکا تھا تو عالم اسلام کے مختلف خطوں میں کئی عبقری شخصیات سامنے آئیں، جنہوں نے مسلمانوں میں نہ صرف فکری اصلاح کی تحریک کو شروع کیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں میں سیاسی اور اقتصادی بہبودی کا شعور بھی پیدا کرنے کی پُرزور کوشش کی، ان شخصیات میں ایک طرف عرب دنیا میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کی اصلاحی تحریک شروع ہوئی، تو دوسری طرف برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے نابغہ عصر شخصیات سامنے آئی، جنہوں نے تمام علومِ اسلامی میں بے بہا خدمات کے علاوہ مسلمانوں کی سیاسی اور سماجی رہنمائی فرمائی۔

مگر ان بیشتر اصلاحی تحریکوں کے مرکوزِ نظر صرف مسلمانوں کے داخلی تشویشناک حالات تھے اور وہ اُسی کا سدِ باب کرنے میں لگے رہے، جبکہ دوسری طرف اس وقت تک یورپ میں اصلاحی تحریک (Reformation)، نشاۃ ثانیہ، صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی ایجادات بھی اپنے عروج پر تھیں، اس بڑھتی ہوئی مغربی طاقت کا اندازہ نہ تو عوام الناس کو تھا اور نہ ہی مسلم مفکرین اور مصلحین کو تھا۔ انیسویں صدی میں یورپ نے باقاعدہ طور پر مسلم علاقوں کو اپنے استعمار کا نشانہ بنایا، دیکھتے ہی دیکھتے مسلم دنیا کے بیشتر علاقوں اور مراکز کو یورپی طاقت نے باآسانی اپنی نوآبادی (Colonies) میں تبدیل کردیا۔ اس فکری جمود اور مغربی استعمار کے خلاف پوری مسلم دنیا میں کئی احیائی تحریکیں اٹھیں، جنھوں نے مسلمانوں میں علمی اور فکری بیداری اجاگر کرنے کے لیے تحریکیں شروع کیں، اس دور میں اگرچہ عرب دنیا میں سیّد جمال الدین، محمد عبدہ، سید رشید رضا کی تحریک اٹھی، برصغیر میں سید احمد بریلوی کی تحریکِ جہاد، سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک، علمائے ہند کی دیوبند تحریک اٹھی، اسی دور میں دوسری طرف وسطِ ایشیا جو کہ اوائل قرونِ وسطیٰ میں مسلم دنیا کا ثقافتی اور علمی مرکز رہا تھا، وہ بھی ایک طرف علمی اور فکری ابتری کا شکار تھا تو دوسری طرف انیسویں صدی کے اختتام تک پورا وسط ایشیا روسی سامراج کا شکار ہوچکا تھا اور اپنی تمام خودمختاری کھو چکا تھا، اسی روسی استعمار کے خلاف اور مسلمانوں میں بڑھتے فکری اور علمی جمود کے خلاف وسطِ ایشیا میں مفکرین اور دانشوروں نے جو علمی بیداری کی تحریک شروع کی، اس تحریک کو تحریکِ جدید کے نام سے جانا جاتا ہے۔

وسط ایشیا میں روسی استعمار:

روسی سامراج نے اگرچہ سولھویں صدی سے ہی وسطِ ایشیا پر دست درازی شروع کی تھی مگر ۱۸ ویں صدی عیسوی تک وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب نہیں ہورہے تھے، چنانچہ اٹھارویں صدی ترکستان کے لیے انتشار وافتراق کا پیغام لے کر آئی، تاتاری خوانین (Khanates) کی آپس کی خانہ جنگیوں سے روسی سامراج نے فائدہ اٹھایا اور ۱۸۸۵ء تک روس پورے مغربی ترکستان پر قابض ہوچکا تھا۔ مسلمانوں کی روسی سامراج کے ہاتھوں شکست کے اسباب کے متعلق مشہور مؤرخ، آبادشاہ پوری اپنی کتاب ''روس میں مسلمان قومیں'' میں لکھتے ہیں، ''جس زمانے میں روس کا سامراجی اژدھا اپنی کنڈلی کا دائرہ وسیع کررہا تھا قازقستان سے ترکستان تک پھیلے ہوئے مسلمان علاقے علمی وفکری لحاظ سے جمود کا شکار ہوچکے تھے۔ منگولوں کے سیلاب اور اس کے بعد آئے دن کے طالع آزما فاتحین کے لائے ہوئے آتش وخوں کے طوفانوں سے بچنے کے لیے طبقہ اشراف اور طبقہ اوسط کے لاتعداد افراد ترکِ وطن کرکے دوسرے مسلمان ملکوں میں چلے گئے۔ اس طرح یہ علاقے اعلیٰ فکری وذہنی صلاحیتوں کے حامل دماغوں سے بڑی حد تک محروم ہوگئے۔ باقی ماندہ لوگ آہستہ آہستہ ختم ہوگئے۔ اذہان کی اعلیٰ تربیت اور ان کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے اور جلا دینے کے لیے اعلیٰ طرز کے فکری وعلمی اور تربیتی اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، جو ان علاقوں میں بہت کم باقی رہ گئے تھے۔ علمی وفکری جمود نے تہذیبی ومعاشرتی زندگی کو متاثر کیا اور پھر رفتہ رفتہ سیاسی زندگی بھی اس کی لپیٹ میں آگئی، جسے مختلف خانوادوں کے طالع آزماؤں نے اور بھی سنگین بنادیا۔ ان جنگوں میں رہا سہا جوہر بھی تیغ وسناں کا شکار ہوگیا''۔

روسی زار کے قبضے کے بعد کچھ ہی دہائیوں میں وسطِ ایشیا میں مسلمان جو کہ اب تک بیشتر علاقوں میں غالب اکثریت رکھتے تھے، نہ صرف ان کی اکثریت متاثر ہونے لگی بلکہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور اقتصادی حقوق پامال ہونے لگے، اس کے ساتھ ساتھ عیسائی مشنریوں کے ذریعہ مسلمانوں میں ارتداد کو فروغ دیا گیا، ٹھیک اسی زمانہ میں جب روسی کلیسا تاتاری مشنریوں کے ذریعے تاتاری مسلمانوں کے دینی افکار پر شب خون مار رہا تھا، تاتاریوں میں احیائے اسلام کی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی۔

تاتاری مسلمانوں میں بیداری اور تحریکِ جدید

انیسویں صدی کے اوائل میں ہی مسلمانانِ وسطِ ایشیا میں چند گراں قدر ہستیاں جو کہ مصلح اور طبیبِ قوم بن کر ابھرے اور اپنی مسلسل کوششوں سے تحریکِ جدید کی فکری بنیاد رکھی، جس کے تحت مسلمانوں کے زوال کی وجوہات پر غور کیا گیا اور ایسے اقدامات کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جو کہ مسلمانوں

کو اپنی عظمتِ رفتہ کی طرف بلائے۔ تحریکِ جدید کی فکری اور علمی کاوشوں سے پتا چلتا ہے کہ تحریکِ جدید کے مندرجہ ذیل بنیادی مقاصد تھے:

ا۔ مسلمانانِ روس کو ذلت کی پستیوں سے نکالنا اور ان میں اپنی ذات، اپنے تمدن کا اعتماد بحال کرنا۔
۲۔ ایک جدید نظامِ تعلیم متعارف کروانا، جس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم مثلاً حساب، جغرافیہ، سائنس اور روسی زبان کی تدریس کا اہتمام ہو۔
۳۔ جدید طرز پر مبنی مدارس کا قیام عمل میں لانا، جن میں مسلمانوں کی فکری اور علمی بنیاد پر تربیت کی جائے۔
۴۔ روس کے اندر رہنے والے تمام مسلمانوں خصوصاً ترکوں میں اتحاد کی فضا قائم کرنا۔
۵۔ ایک ایسی زبان رائج کرنا جو روس میں بسنے والے تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان کا کردار ادا کرے۔
۶۔ جدید مسائل کا اسلامی حل نکالنے کے لیے اجتہاد کا استعمال کرنا۔

اگرچہ تحریکِ جدید کی عملی شکل انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں (۱۸۸۰۔۱۹۰۰) میں منظرِ عام پر آئی، جب عملی طور پر 'اصولِ جدید' کے نام سے نئے اسکول کھولے گئے، مگر فکری اور علمی طور پر تحریکِ جدید کی بنیاد انیسویں صدی کے آغاز سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ تحریکِ جدید کے ابتدائی رہنماؤں میں سرفہرست ابونصر القرضاوی (۱۷۸۳۔۱۸۱۴) اور شیخ شہاب الدین المرجانی (۱۸۱۸۔۱۸۸۹) کو مانا جاتا ہے۔ ابونصر القرضاوی فکرِ جدید کے پہلے مصلح تھے جنہوں نے سب سے پہلے اندھی تقلید، علم الکلام کی بہ وجہ مُشگافیوں کے خلاف آواز اٹھائی اور اجتہاد و آزادیِ رائے کی حمایت کی۔ چونکہ ابوانصر القرضاوی کو روایت پسند علما کی مخالفت کا سامنا تھا، اس لیے انہوں نے صرف مسلمانوں میں بیداریِ فکر کا شعور پیدا کیا، جو تقلید پسندی اور جمود پسندی کے خلاف پہلا اعلان تھا۔ القرضاوی کے بعد شیخ شہاب الدین المرجانی تحریکِ جدید کے فکری معمار بن کر سامنے آئے۔ المرجانی کو دورانِ طالب علمی ہی سے اپنے اساتذہ اور علما کے فکری و ذہنی جمود کا شدت سے احساس ہو گیا تھا، انہوں نے جب صورتحال پر غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس فکری جمود اور شکستِ حالی کی اصل ذمہ دار اس پرانے طرزِ تعلیم پر عائد ہوتی ہے، جو مدارس میں رائج تھا۔ چنانچہ وہ بخارا سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دینی درسگاہوں میں اصلاح کا عزم لیے واپس اپنے وطن لوٹے، انہوں نے علما کے فکری جمود اور تنگ نظری پر سخت تنقید کی۔ المرجانی کی اصلاحی فکر کا مرکز مندرجہ ذیل نکات تھے:

ا۔ ہر مسلمان مذہب سے متعلق اپنے سوالات کے جواب خود قرآن سے حل کرنے کی کوشش کرے۔
۲۔ اندھی تقلید کی روایت کو ختم کیا جائے۔
۳۔ قدیم روایتی نصابِ تعلیم کو نظامِ تعلیم سے خارج کرنا۔
۴۔ مدارس میں قرآن، حدیث اور تاریخ اسلام کے مضامین کی تدریس کو جدید انداز میں متعارف کروانا۔
۵۔ مسلمانوں کو اپنی ابتدائی پرانی ثقافت کی طرف بلانا۔
۶۔ المرجانی کو جس انقلابی شخصیت کے نظریات اور زندگی نے متاثر کیا تھا، وہ امام غزالیؒ تھے، انہوں نے اپنی ساری زندگی اس جدوجہد میں گزاری کہ اسلام کو مخصوص علما کے روایتی چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ اسلام آج بھی دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرسکتا ہے اور دورِ جدید کی سائنس کا تسلی بخش جواب مذہب سے دینے کی اہلیت رکھتا ہے اور ان کا یقین تھا کہ اسلام کے آفاقی اصولوں کی مدد سے آج بھی اسلام کی عظمتِ رفتہ کو واپس لایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ المرجانی نے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی اور ۱۸۶۶ء میں اپنے تعلیمی نظریات کے مطابق ایک نیا دینی مدرسہ قائم کیا، بعد ازاں تاتاری علاقوں میں اس قسم کے مدارس کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان نئے طرز کے مدارس کو کریمیا کے اسماعیل گسپرالی (۱۸۵۱۔۱۹۱۴ء) نے ایک نیا رنگ دیا، گسپرالی کو ترکستان کی تحریک جدید کا اصل معمار مانا جاتا ہے۔ اسماعیل گسپرالی نے جن نئے مدارس کی بنیاد رکھی، انہیں 'اصولِ جدید' کا نام دیا گیا، بعد ازاں اسی 'اصولِ جدید' کی مناسبت سے اس فکری تحریک کو 'جدیدازم' یا تحریکِ جدید کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔
۷۔ اسماعیل گسپرالی کے ان قائم شدہ مدارس میں اسلامی مضامین کے علاوہ دور جدید سے متعلق مضامین کی تدریس کا اہتمام کیا گیا۔ مدارس میں روسی زبان سیکھنے پر خصوصی زور دیا گیا، یہ تمام اصلاحات اس مقصد کے تحت تھیں کہ مسلمان تعلیمی میدان میں دوسری قوموں سے کٹ کر نہ رہ جائیں۔

تحریکِ جدید اور اصولِ جدید کے مدارس

ابتدائی طور پر اسماعیل گسپرالی نے اپنے مقاصد کے حصول کے وقت سیاست سے پرہیز کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر روسی اقتدار کے خلاف جدوجہد کی گئی تو مسلمان کچل دیے جائیں گے۔ چنانچہ گسپرالی نے اس وقت کے حالات کے تحت روس نواز موقف ضرور اختیار کیا لیکن وہ سلطنتِ روس کے اسلامی علاقوں کو روسیانے کی پالیسی کے سخت خلاف تھے۔ دراصل وہ اسلام میں جدیدیت اور تورانیت کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، گسپرالی کا نظریہ تھا کہ اسلام ترکوں اور تاتاریوں کے کلچر کا لازمی جزو ہے۔ اسماعیل گسپرالی فکری طور پر اپنے دور کے متعدد علمی اور فکری تحریکوں سے متاثر تھے، ایک طرف دورانِ قیامِ پیرس وہ کسی حد تک لبرل ازم کی تحریک سے متاثر ہو گئے تو دوسری طرف قیامِ مصر میں وہ سید جمال الدین افغانی کی تحریکِ اخوتِ اسلامی سے بھی متاثر ہوئے، اس کے علاوہ وہ ترکی کی نوجوان تحریک سے بھی کافی متاثر تھے، یہ سب اثرات گسپرالی کی سیاسی، سماجی، اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں میں پوری طرح کارفرما رہے۔ وہ بیک وقت اسلامی اتحاد کے علمبردار بھی تھے، عربی زبان کو اہمیت بھی دیتے مگر ساتھ ساتھ بعض مغربی اصلاحات کو اپنانے کے خواہش مند بھی تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے گسپرالی نے ذرائع ابلاغ اور نئے طرز کے مدارس کا بھرپور استعمال کیا۔ ۱۸۸۳ء میں انہوں نے اپنا اخبار 'ترجمان' شائع کیا جو دودہایوں تک کاشغر سے لے کر کریمیا بلکہ قسطنطنیہ تک مسلمانوں کی فکری اور علمی رہنمائی کرتا رہا۔ اسماعیل گسپرالی نے 'ترجمان' کے ذریعے نہ صرف مسلمانانِ روس کو درپیش سیاسی، اقتصادی اور فکری چیلنجوں کا جواب دیا بلکہ 'ترجمان' کے ذریعے وہ ایک ایسی زبان کو ترویج دینے کی کوشش کر رہے تھے، جو روس کے ترکی النسل مسلمانوں کی مختلف چھوٹی چھوٹی زبانوں کی جگہ روس کے تمام مسلمانوں کی مشترکہ زبان بنے۔ اس طرح گسپرالی اور ان کے پیروکاروں کی کاوشوں سے روسی مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ ملا، اور ترکی زبان میں کتابوں کی اشاعت اور طباعت کا سلسلہ شروع ہوا اور مسلمانوں میں علمی اور فکری بیداری کی تحریک دن بہ دن مضبوط ہونے لگی۔

جہاں اصولِ جدید کے مدارس میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا اور وہ نئی نسل کے فکر و ذہن کو نئے سانچے میں ڈھال رہے تھے، وہیں وسطِ ایشیا میں قدیم طرز کے مدارس بھی

سرگرمِ عمل تھے، جہاں نئے زمانے کی رفتار اور نئے دور کے مسائل کا نہ تو کوئی احساس تھا اور نہ گزر۔ ان روایتی مدارس کی فضا دسویں صدی عیسوی کی تھی، انہیں نصاب میں کسی قسم کا تغیر وتبدل گوارا نہ تھا۔ چنانچہ جب جدیدیوں نے اصولِ جدید مدارس کے ضمن میں اپنی کوشش شروع کیں تو انہیں قدیم علما کی طرف سے سخت تنقید اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، اس کے علاوہ روسی حکومت کی مخالفت کا بھی سامنا تھا، جو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں سے خوفزدہ ہوگئی تھی، اس کے ساتھ ہی ایک اور مخالفت عیسائی مشنریوں کی طرف سے تھی، جو مسلمانوں کو روسی بنانے کے حق میں تھے۔ نظامِ تعلیم میں اصلاحات کے علاوہ تحریک جدید کے مصلحین غیر مسلم حکمرانوں کے زیر تسلط مسلمان کالونیوں میں مغربی جدیدیت اور اسلامی عقیدے اور ثقافت کے درمیان ٹکراؤ سے پیدا شدہ مسائل کو مناسب انداز میں حل کرنے کے لیے کوشاں رہے، انہوں نے پہلے مسلمانوں میں اندرونی کمزوریاں دور کرنے کی سعی کی اور مسلمانانِ وسطِ ایشیا میں فکری اور لسانی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۰۵ء کے پہلے روسی انقلاب کے بعد تحریک جدید نے باقاعدہ سیاسی جدوجہد شروع کیا اور 'اتفاق المسلمین' کے نام سے اپنی سیاسی جماعت بنائی، جس نے پہلے ہی عام انتخابات میں حصہ لے کر ۵۳ نشستیں حاصل کیں، مگر چونکہ روس میں یہ سیاسی آزادی کا مختصر دور رہا، جس کی وجہ سے تحریک جدید کی سیاسی سرگرمیوں کو پوری طرح کچل دیا گیا۔

۱۹۱۷ء کے روسی انقلاب کے بعد جب زار شاہی کے بدلے سویت یونین نے حکومت پر قبضہ جمایا تب مسلمانانِ روس کا سب سے سخت اور مشکل دور شروع ہوا، ایک طرف مذہبی آزادی سلب کر لی گئی تو دوسری طرف اقتصادی، سیاسی استحصال کو فروغ دیا گیا، ان حالات میں عوام کی بڑی تعداد کے ساتھ ساتھ کئی مصلحین نے بھی وسطِ ایشیا سے ہجرت کی، مگر ان حالات میں بھی کئی جدید مفکرین نے مسلمانوں میں تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگرچہ سوویت یونین کی استحصالی پالیسی کی وجہ سے تحریک جدید کا سیاسی اور عملی وجود کافی حد تک متاثر ہوا مگر تحریک جدید کے کئی مفکر کسی نہ کسی طرح اپنا پیغام مسلمانوں تک پہنچاتے رہے۔

روسی اشتراکی انقلاب اور تحریکِ جدید کی فکر پر اس کا اثر

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اگرچہ ایک طرف وسطِ ایشیا کے مختلف علاقوں میں تحریک جدید کے نام پر کافی سارے مفکرین ابھرے، مگر دوسری طرف سویت یونین کے اقتدار سنبھالنے کے بعد مسلمانوں کی مشکلات میں اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا۔ اگرچہ یہ بات ایک طرف مسلمہ حقیقت ہے کہ تحریک جدید کا قیامِ عمل مسلمانوں کی دینی، علمی اور فکری بیداری کے لیے کیا گیا تھا، تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریک جدید کے بہت سے مفکرین مغربی جدیدیت (Western Modernism) اور لبرل ازم (Liberalism) کے تصورات سے متاثر ہونے لگے، تاہم سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کی طرح تحریک جدید نے تعلیمی محاذ پر مسلمانانِ وسط ایشیا کی جو خدمات سرانجام دیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔

اسماعیل گسپرالی کے بعد تحریک جدید کے جو سرکردہ مصلحین اور مفکرین وسطِ ایشیا کے مختلف خطوں میں اٹھے ان میں، منور قاری (۱۹۳۳ء۔۱۸۸۹ء)، ریاض الدین (۱۹۳۶ء۔ ۱۸۵۹ء)، موسیٰ جارا (۱۹۴۹ء۔۱۸۷۵ء)، جیسی علمی اور فکری شخصیات سرفہرست ہیں۔ تحریکِ جدید کے مدارس اور ان کی فکر پر مغربی تصورات کے اثرات کے متعلق محقق آبادشاہ پوری تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''چونکہ خود اسمٰعیل گسپرالی فکری یکسوئی سے محروم تھے۔ اس لیے یہ مدارس بھی انتشارِ فکر کا سرچشمہ بن گئے۔ سیاسی قوم پرستی اور تورانی تحریک نے انہی مدارس میں جنم لیا' سوشلزم اور مارکسٹ نظریات نے بھی یہیں فروغ پایا' روسی مسلمانوں میں بائیں بازو یا خالص سیکولر ذہن وفکر رکھنے والے جتنے رہنما اور فعال وسرگرم کارکن تھے وہ سب انہی جدید مدارس کے فیض یافتہ تھے۔ اس طرح جس تحریک کا آغاز شہاب الدین المرجانی نے اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ اور اسے دنیا میں موثر طاقت بنانے کے نیک عزائم کے ساتھ کیا تھا' اس کے نتائج تباہ کن نکلے''۔ مختصراً تحریک جدید کے اجمالی جائزے اور تجزیے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تحریکِ جدید بھی انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی کی ان متعدد مسلم اصلاحی، احیائی تحریکوں میں ایک تھی، جنہوں نے مسلمانوں میں بڑھتے علمی فقدان، فکری جمود، تقلید پسندی، جدید علوم سے دوری اور مغربی استعمار کے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی، باقی تحریکوں کی طرح اس تحریک میں بھی کافی ساری کمزوریاں تھیں، اس تحریک کے نتیجے میں اگرچہ ایک طرف مسلمانانِ وسطِ ایشیا میں علمی اور فکری شعور بیدار ہوا تو دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ کافی حد تک مغربیت کے زیر اثر آیا۔

(بحوالہ:'زندگی نو' نئی دہلی۔ جنوری ۲۰۱۸ء)

| | |

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہوجائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں' تاکہ پچھلے پتے پر جا کر پرچہ ضائع نہ ہو۔ اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہوگیا ہو یا اب اِسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جا سکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''معارف فیچر' جاری ہوجانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب/صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاء اللہ ملتا رہے گا' تا آنکہ وہ خود منع کردیں۔ اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں' کچھ اور ہوسکتا ہے۔ مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہوجانا۔ لہٰذا ''معارف فیچر' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ہم آپ کے تعاون' دعاؤں' مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔ (مدیر)

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوائیے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجئے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

چین نے قطب شمالی میں سِلک روڈ کا آغاز کر دیا!

Jane Nakano

۲۸ جنوری ۲۰۱۸ء کو چین کے اسٹیٹ کونسل انفارمیشن کے دفتر نے پہلی بار ملک کی سرکاری قطب شمالی پالیسی کے بارے میں وائٹ پیپر جاری کیا۔ دستاویزات سے خطے میں چین کے مستقبل کے ترقیاتی اہداف کے بارے میں اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دستاویز میں سائنسی، تجارتی، ماحولیاتی تحفظ، معدنی وسائل کو نکالنے کے منصوبوں کے ساتھ بیلٹ روڈ منصوبہ بھی شامل ہے۔ راستوں کے ساتھ انفرااسٹرکچر کی تعمیر اور امکانات کا جائزہ لینے کے لیے کمرشل خلائی اور سمندری سفر کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے چینی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

۲۰۱۷ء میں چینی تحقیقی کشتی زولانگ نے پہلی بار قطب شمالی میں تین اہم سمندری راستوں کا پتا لگایا۔ جس میں شمال مغربی راستہ، شمال جنوبی راستہ اور ٹرانس پولر سمندری راستہ شامل ہے۔ دستاویزات میں چین نے قطب شمالی کے پرامن استعمال پر زور دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرحدی حدود اور سمندری حقوق سے متعلق تنازعات کا حل باہمی معاہدوں اور اقوام متحدہ کے کنونشن کے تحت کرنے کی حمایت کی ہے۔ اس منصوبے کے تحت چین کی سرحد کو قطب شمالی تک توسیع نہیں دی گئی۔ چین قطب شمالی کونسل کے ۱۳ مبصرین میں سے ایک ہے اور خطے میں اپنی سرگرمیاں بڑھا رہا ہے۔ چین نے پانچ سال تک رکن رہنے کے بعد ۲۰۱۳ء میں مستقل مبصر کا درجہ حاصل کیا۔ اس سے قبل دو دفعہ وہ مبصر بننے کی کوشش کر چکا تھا۔ مستقل مبصر بننے کے بعد چین کو کونسل کے تمام اجلاسوں اور ورکشاپس میں شرکت کا اختیار حاصل ہو گیا ہے۔ شمالی قطب کے خطے میں چین کی دلچسپی کی وجہ توانائی کے ممکنہ ذخائر، تجارت اور جغرافیائی سیاسی فوائد ہیں، مگر ان سب کو حاصل کرنے کی اپنی شرائط ہیں۔

خطے میں توانائی کے ذخائر اور معدنی وسائل موجود ہیں، اندازہ ہے کہ خطے میں دنیا کے ۱۳ فیصد خام تیل کے ذخائر اور ۳۰ فیصد قدرتی گیس کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ تیل اور گیس کے ذخائر برف کی موٹی تہہ اور سخت موسم میں زیرِ سمندر موجود ہیں۔ مستقبل میں ان ذخائر کو نکالنے کی کوششوں کا راستہ سمندر کی مضبوط برف روک سکتی ہے۔ اس وقت چین کا قطب شمالی سے سب سے اہم تعلق روس میں یامل ایل این جی گیس کا منصوبہ ہے، اس منصوبے میں چینی کمپنیوں نے بھاری سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ اس منصوبے کے ذریعے چین طویل مدتی عرصے کے لیے ۱۹۵ ارب کیوبک فٹ گیس کی سالانہ بچت کرے گا۔ قطب شمالی کے تیل اور گیس کے ذخائر کی کھپت کا انحصار تیل اور گیس کی عالمی منڈی کی صورتحال اور سپلائی کے دیگر ذرائع پر بھی ہے، جس میں امریکا کے غیر روایتی ذرائع بھی شامل ہیں۔

قطب شمالی سے تیل اور گیس نکالنے میں کئی رکاوٹیں ہیں، جس میں سخت موسم، بھاری خرچہ، محدود انفرااسٹرکچر، پیداواری مراکز سے طویل فاصلے، ماحولیاتی حساسیت شامل ہیں۔ ان مسائل نے ماضی میں شمالی روس اور الاسکا میں کئی منصوبوں کو مکمل نہیں ہونے دیا۔ قطب شمالی کے خراب سمندری حالات کے پیش نظر ممکنہ طور پر مستقبل میں توانائی منصوبوں کو زیادہ چیلنجوں کا سامنا ہو سکتا ہے۔ قطب شمالی کا سمندری راستہ مختصر ہونے کی وجہ سے تجارتی طور پر پرکشش ہے۔ شمال مغربی اور شمال مشرقی دو بنیادی متبادل راستے ہیں جن کے ذریعے یورپ اور شمالی امریکا کے توانائی کے ذخائر کو تیزی کے ساتھ چین پہنچایا جا سکتا ہے، ان راستوں سے روایتی روٹرڈیم جیسے راستوں کے مقابلے میں ہفتوں پہلے پہنچا جا سکتا ہے۔ قطب شمالی میں موجود تیسرا راستہ ٹرانس پولر سمندری راستہ شمال مغربی اور شمال مشرقی راستوں کے درمیان سے ہوتا ہوا بین الاقوامی پانیوں تک پہنچتا ہے۔ مگر یہ راستہ صرف بھاری آئس بریکر شپ ہی پار کر سکتا ہے۔ سمندری راستہ مختصر ہونے کا مطلب ایندھن کی بچت اور اخراجات میں کمی ہے۔ قطب شمالی میں شمالی سمندری راستے کے علاوہ اکثر جگہوں پر انفرااسٹرکچر اور امدادی سہولتوں کی صورتحال بہت خراب ہے۔ اس کے علاوہ بیمہ کی رقم میں اضافہ، تبدیل ہوتے موسمی حالات بھی ان راستوں میں حائل بڑی رکاوٹیں ہیں۔ کئی دہائیوں بعد ہو سکتا ہے کہ ان راستوں پر تجارتی سامان کی آمد و رفت میں اضافہ ہو جائے۔ شمالی قطب کے سمندر میں چینی تجارتی جہازوں کے آمد و رفت کی وجہ سے سیکورٹی میں اضافہ بھی کرنا پڑے گا۔ شمالی مشرقی راستہ روس کے خصوصی اقتصادی زون کے اندر سے ایک متبادل راستہ فراہم کرتا، اس راستے کے ذریعے آبنائے ملاکا پر موجود بدترین رش اور بحیرہ احمر اور بحیرہ ہند میں موجود بحری قزاقوں سے بھی محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں سوئس کنال میں چینی بحری جہاز پر قزاقوں کے حملے سے سیکورٹی خطرات ابھر کر سامنے آئے، دوسری جانب اس حملے کے وقت ایک اور چینی جہاز طویل شمال مشرقی راستے کے سفر کے اختتام کے قریب تھا۔ چین ممکنہ طور پر شمالی قطب میں تجارت اور توانائی کے ذخائر کی تلاش میں زیادہ سرگرم کردار ادا کرتا نظر آ سکتا ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ چین اپنا جیو پولیٹکل اور جیو اکنامکس کردار مضبوط کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر شمال قطب کے سمندر میں موجود راستے چین کو یورپ تک جانے کے نہر سوئس جیسے روایتی راستوں کا بہتر متبادل فراہم کرتے ہیں، اور ویسے بھی ان روایتی راستوں پر امریکا کی فوجی برتری قائم ہے۔ دستاویزات میں بیلٹ اور روڈ منصوبے کے علاوہ قطب شمالی میں چینی ترقی کے اہداف کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ چینی سرمایہ کاری کا بڑا حصہ جنوب میں شپنگ کی صلاحیت بڑھانے، ریل اور پائپ لائن انفرااسٹرکچر کو بہتر بنانے پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ چین کا قطب شمالی میں سلک روڈ کے ساتھ انفرااسٹرکچر تعمیر کرنے کا منصوبہ اسے ایک متبادل راستہ فراہم کرے گا۔ یہ منصوبہ دنیا کی توجہ اپنی طرف کھینچے گا، قطب شمالی کے حوالے سے چین کے منصوبے پر مغربی خدشات کو دور کرنے کے لیے وائٹ پیپر جاری کرتے وقت چین کے نائب وزیر خارجہ کا کہنا تھا کہ ”ہماری نیت پر شک کرنا، وسائل کو لوٹ لینے کے خدشات کا اظہار کرنا، ماحول کی تباہی کی فکر کرنا غیر ضروری ہے“۔ شمالی قطب کا علاقہ بے پناہ وسائل، تجارتی اور جیو پولیٹکل فائدے رکھتا ہے، اس وجہ سے یہ خطہ چین کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے اہم ترین بن سکتا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب امریکا بین الاقوامی وعدوں سے پیچھے ہٹ رہا ہے، چین چاہتا ہے کہ اسے ایک اہم اور ذمے دار ریاست کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ ایک ایسی طاقت جس کی عالمی رسائی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے، ایسے میں شمالی قطب میں ترقی کا چینی منصوبہ چین کے وسیع جغرافیائی سیاسی تصور کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

"China launches the polar silk road".
(""csis.org". February 2, 2018)

| | |

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950